نسب نامہ سادات بجنور

جلد اوّل بزبان اردو

جلد دوئم بزبان انگریزی (مخالف سمت)

اندراجات شجرہ نسب: بمطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء
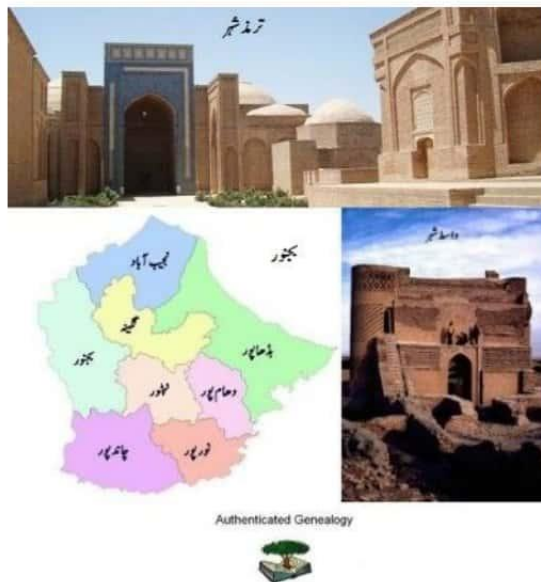
مرتّبہ: عمران متانت حسین
۲۴ پرِوس کریسینٹ
ٹورونٹو، اونٹیریو، M1B 1H9

السید کاشان رضا زیدی رسولدار

مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور

نسب نامہ سادات بجنور

جلد اوّل بزبان اردو

نسب نامہ سادات بجنور

جلد اوّل بزبان اردو

انتساب

اپنے محترم والدین **شجاعت حسین** (مرحوم) اور محترمہ **تعظیم فاطمہ** اور اپنے اہل و عیال
ماہ طلعت زیدی (زیبا)، طٰہٰ زیدی، مرتضٰی زیدی، مصطفٰی زیدی کے نام

یا حجتہ القائم علیہ السلام ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤ الدین رسولدار رحمتہ اللہ
زیدی الحسینی مدینہ السادات اوچ شریف
نظر کرم
سخی السید مروت حسین زیدی صاحب الحسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی رحمتہ اللہ الحسینی رسولدار
03007579114 وٹس اپ نمبر
محلہ علی پور پاکپتن شریف

فہرست عنوانات

🚩تذکرہ🚩
السید ریاست حسین
زیدی رسولدار
درکتاب ھذا
صفحات نمبر
35
86
88
90

🚩تذکره🚩
السید کاشان رضا زیدی
الحسینی رسولدار
سجاده نشین آستانہ
السید ریاست حسین
زیدی رسولدار
درکتاب ھذا
صفحہ نمبر
35

تذکرہ

سادات رسولدار

درکتاب ھذا

صفحات نمبر

40

48

57

89

تذکرہ

🚩 محلہ رسولداران 🚩

نہٹور

درکتاب ھذا

صفحات نمبر

87

89

اعتراف

عمران متانت حسین

میرے آباء واجداد دین اسلام کی خدمت سے سرشار تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مخصوص صفات اور صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وہ ہندوستان میں دین اسلام کی تبلیغ کے مقصد سے آئے تھے اور عظمت وسربلندی کا ستارہ بن کر چمکے۔ میں عرصہ دراز سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنے عزیز واقارب کو ان کی خدمات اور خاندانی پس منظر کو ایک جامع نسب نامے کی صورت میں روشناس کراؤں شجرہ نسب سے متعلق ضروری معلومات کو اکھٹا کرنے کا کام محترم خورشید عالم زیدی نے کئی دہائیوں پہلے شروع کیا تھا لیکن میرے شوق کو سراہتے ہوئے مجھے بھی یہ معلومات فراہم کردیں تھیں۔ یہی نہیں، بلکہ محترم خورشید عالم زیدی نے مجھے متعلقہ کمپوٹر کا نظام بھی تفویض کردیا تھا۔ میں اس گراں قدر عنایت پر ان کا احسان مند ہوں۔ اس غرض سے میں نے تیرہ ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل سادات بجنور کا شجرہ نسب مرتب کر کے اسے کتابی شکل میں ڈھالا تو بہت جلد مجھے اپنی کمزویوں کا احساس ہوگیا۔ ایک پیشہ ور انجنیئر کی حیثیت سے میں نے انگریزی میں توکئی طویل مقالے لکھے تھے لیکن اردو میں خط وکتابت کا مجھے شاذ ونادر ہی اتفاق ہوُا تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ نسب نامہ سادات بجنور کی تدوین کے سلسلے میں ماہرین سے اصلاح لینالازمی ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی کاوش کو محترم میثاق حسین صاحب کو دکھا کر ان سے پیشہ ورانہ اعانت کی درخواست کی۔ انہوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کتاب میں مزید اہم موضوعات کا اضافہ کرنے کا مشورہ دیا اور ہر قدم پر اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلا کر میری رہنمائی کی۔

جہاں تک محترم میثاق حسین صاحب کا تعلق ہے تو وہ سادات بجنور (بشمول نہٹور اور مضافاتی قصبات) کے ان افراد میں شامل ہیں جن کو اپنے آبائی وطن سے خصوصی لگاؤ ہے۔ مشاہیر بجنور سے متعلق ان کی معلومات وسیع اور قابل اعتماد ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے رٹائیر منٹ کے بعد انہوں نے صحافت کے شعبے میں اپنی تخلیقی اور ادبی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ انہیں حالات حاضرہ کا خاص ادراک ہے اور مختلف جرائد میں مضمون نگاری کا وسیع تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ انٹرنیٹ پر بھی اپنے حلقہ احباب کو مختلف موضوعات پر ادبی تخلیقات سے نوازتے رہتے ہیں۔ صاحب موصوف ایک آزاد روزنامہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

میرے عہد طفلی کے زمانے میں کراچی سے مرقع سادات نہٹور نامی جریدہ شائع ہوُا کرتا تھا جس کے مدیر ذکی حیدر صاحب تھے جن کی معاونت اقرار احمد اور شباہت حیدر صاحب کیا کرتے تھے لیکن محترم میثاق حسین صاحب بھی اس جریدے کے لئے رآولپنڈی سے خبریں اکھٹی کیا کرتے تھے۔ اس ماہانہ جریدے میں خاندان کے مختلف افراد سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ جریدہ دراصل انجمن سادات نہٹور کی طرف سے جاری کیا جاتا تھا۔ یہ انجمن سادات نہٹور کی فلاح وبہبود کے لئے قائم کی گئی تھی اور حاجی محمد خلیل صاحب اس کے صدر تھے۔ ان کی مجلس عاملہ میں محترم عثمان حیدر، حافظ عبدالرشید ندوی، محترم حسن زیدی، محترم اقرار احمد، محترم آفتاب احمد اور محترم ریاست حسین بھی شامل تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ افراد مختلف مقامات پر نقل مکانی کر گئے یا فوت ہوگئے۔ اس طرح یہ انجمن آہستہ آہستہ انتشار کا شکار ہو کر تحلیل ہوگئی اور مرقع سادات نہٹور بھی بند ہوگیا۔ تقریباً ربع صدی کے بعد محترم خورشید عالم زیدی نے انٹرنیٹ کے ذریعے مرقع سادات نہٹور کو از سر نو جاری کیا اور برادری کے لوگوں کو رکنیت کی دعوت دی۔ شروع میں تو اس گروہ میں بہت کم لوگ شامل تھے لیکن رفتہ رفتہ کئی خاندان کے افراد کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے بھی محترم خورشید عالم زیدی کی انتظامی امور میں معاونت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے لیکن محترم میثاق حسین اس محفل کے مستقل قلمکار تھے اور انہوں نے ایک عشرے سے زیادہ مدت تک اپنی نگارشات اس محفل میں شائع کیں۔ ایک بار پھر انجمن سادات نہٹور کے احیاء کی کوششیں کی گئیں اور میری ہی تجویز پر محترم میثاق حسین زیدی کو اس کی سربراہی کے لئے نامزد کیا لیکن کچھ ناگفتہ بہ وجوہات درپیش ہونے سے یہ انجمن اب فعال نہیں رہی۔ بلآخر کئی سال پہلے انٹرنیٹ پر خدمات فراہم کرنے والے ادارے نے مرقع سادات نہٹور کو تحلیل کرنے کی ہدایت کی اور یہ باہمی رابطے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ محترم خورشید عالم زیدی نے ایک دوسرے ادارے کی خدمات حاصل کر کے تقریباً تمام سابقہ خبریں ایک نئے نام سے متعارف بھی کروائیں لیکن ابھی اس نئے نظام میں بہتری کی گنجائیش ہے۔

یہ تو تھی میرے محترم بزرگوں کی مختصر خدمات کی روئداد لیکن جب میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں یہ پیشکش منتشر خیالات کا شکار ہو کر غیر مربوط عبارات کا مجموعہ نہ بن جائے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ نسب نامہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔ محترم خورشید عالم زیدی نے میری یہ مشکل بھی دور کر دی اور کئی بار مجھے ضروری ترامیم اور اضافہ جات ترسیل کیے۔ اس تعاون کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں محترم یثاق حسین کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی مشغولیت کے باوجود مجھے مسودہ کی از سر نو ترتیب اور اس کے بعد طباعت سے متعلق مفید مشورے دے کر میرے لئے اس کتاب کی اشاعت کو آسان بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو جزائے خیر دے۔

باسمہ تعالیٰ

پیش لفظ

میثاق حسین

بارک اللہ۔

اے عزیز من! عمران متانت حسین المعروف رونی!!

ضلع بجنور میں شامل تمام چھوٹی بڑی بستیوں کے بزرگوں (وہ جہاں بھی ہیں) کی جانب سے شاباش۔ مکرّر شاباش۔ پر خلوص دعائیں۔ تشکّر۔

بہت خوشی کا مقام ہے کہ تمہاری برسوں کی ریاضت رنگ لائی۔ اس کتاب "نسب نامہ سادات بجنور" کے شائع ہونے کی خبر سنائی۔ جو محنت کرتا ہے وہی کامران ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب کا ایک روز احتساب ضرور ہوگا۔ پوچھا جائے گا کہ جس دنیا کو پیچھے چھوڑ کر آئے ہو اس میں تمہاری کارکردگی کیسی رہی؟ "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔ "تمہارے ہاتھوں میں آلِ سیّد السادات کا یہ نسب نامہ ہوگا۔ تم جواب دوگے: اے میرے رب! تو نے مجھے جو زندگی عطاء کی میں نے اسے رائگاں نہیں جانے دیا۔ زندگی کے اس عطیے سے میں نے کچھ وقت اپنے خاندان کے اسلاف کی شناخت قائم رکھنے کے لئے صرف کیا۔ بس اتنی ہی میری بساط تھی۔ "تو دانی حسابِ کم و بیش را۔"

تصور سے حقیقت تک پہنچنے کا یہ سفر بہت آسان نہیں رہا ہوگا۔ بار بار حوصلہ ٹوٹا ہوگا۔ بار بار سانس پھولا ہوگا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ تمہارے عزم نے ہر رکاوٹ کو شکست دی اور تمہارے قدم منزل کی جانب بڑھتے رہے۔ تم نے وسط ایشیاء میں اپنے بزرگوں کی تلاش میں ترمذ کے گلی کوچوں کی خاک چھانی۔ سید کمال الدین ترمذیؒ کے قافلے کے ہمرکاب ہو کر ہریانہ ندی پہنچے اور پھر ضلع بجنور کی بستیوں کی طرف پیش قدمی کی۔ اب تمہارے توسّط سے اس تصوراتی سفر کی روئیداد ہمارے سامنے ہے۔ بہت کچھ تو تم نے خود ہی لکھ دیا ہے۔ لازم ہے کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ ترمذ کا تاریخی پس منظر۔ سیاست دوراں۔ ثقافتی شکست و ریخت۔ اپنی نسل کی بے بسی۔ اگلی نسل کی بے حسی۔ مجہول رشتوں کی دھندلاہٹ وغیرہ۔ میری تحریر میں انتشار کا جواز ہے۔ میرے زمانہ نے جو انتشار دیکھا ہے اس کا سایہ میرے ذہن کی اسکرین پر موجود ہونا ایک فطری بات ہے۔ آؤ کوئے یار کی باتیں کریں۔

دریائے آمو (یونانیوں نے آکسس اور عربوں نے جیجون کہا۔ ماور اُلنہر بھی مشہور ہے) کے دائیں کنارے پر ترمذ ہے۔ ازبکستان کا چھوٹا سا سرحدی شہر جو کبھی چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں ہوتا تھا۔ دریائے آمو کے پار افغانستان ہے۔ اب انسانوں کے توسیعی عزائم اور ان کے عسکری مقاصد کی وجہ سے سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ ترمذ کی آبادی کے باہر ریت کا ایک ٹیلہ تھا۔ اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھو تو دریائے آمو کے آر پار آمد و رفت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اب دریا پار آنے جانے کے لئے ایک عمدہ پل تعمیر ہو گیا ہے۔ گذشتہ کئی عشروں سے تمام نقل و حرکت اسی پل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بین الاقوامی مصلحتوں کا تقاضہ تھا لہٰذا ترمذ میں تعمیر و ترقی کے کام بھی ہوئے ہیں۔

ریت کا یہ ٹیلہ جو جدید تعمیر و ترقی سے اب پس منظر میں چلا گیا ہے کسی کے لئے اہم ہو یا نہ ہو، ہم آلِ سید السادات کے لئے بہت اہم ہے۔ اس تاریخی ٹیلے پر زید شہیدؒ کا خانوادہ جمع ہوا تھا اور میر سید کمال الدین ترمذیؒ کے کاروان کو سوئے ہند روانہ ہوتے وقت دریائے آمو میں گھوڑے ڈالتے دیکھا تھا۔ وہ بھی کیا منظر ہو گا۔ شوق، جذبہ، عزم اور نعرے۔ چلو ہندوستان چلیں۔ ہجرتوں کے تسلسل میں ایک اور ہجرت۔ نئی منزلوں کی تلاش، تازہ بستیاں آباد کرنے کا پیمان۔

ایک بزرگ کمال الدین عبد الرزّاق بن اسحاق سمرقندی (۱۴۸۲-۱۴۱۳ء) گزرے ہیں۔ ان کے ابا حضور ہرات کے حاکم کے قاضی تھے۔ خود کمال الدین کی پیدائش ہرات کی ہے۔ ان کی وجہ شہرت اسلامی اسکالر، تیموری وقائع نویس مصنف مطلع السعدین و مجمع البحرین کی ہے۔ یہ ان کا سفر نامہ ہے۔ حاکم ہرات نے جنوبی ہند کی سرکار میں ایرانی سفیر مقرر کیا اور چین کا دورہ کر کے وہاں کے حالات لکھنے کا مشن دیا۔

موصوف اس وقت کے 'کالی کٹ' تک پہنچے۔ سفر سے خوف کھاتے تھے۔ جتنا سفر کیا وہ آہوں اور کراہوں سے بھرپور ہے۔ چین جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور آئندہ اس نوع کی مہم جوئی سے توبہ کر کے واپس ہرات چلے گئے۔ اپنے سفر اور تجربات پر مبنی فارسی کتاب 'مطلع السعدین و مجمع البحرین' تصنیف کی جو ہمارے زمانہ کے لڑکوں/لڑکیوں کو بالاہتمام پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے اور برادرم مصداق حسین زیدی نے یہ کتاب (بعمر ۱۳۔ ۱۲ سال) اپنے استاد محترم مولانا عبد الغفور سے پڑھی۔ ہم دونوں نے دریائے آمو کا نام پہلی بار اسی کتاب میں پڑھا۔ ان دنوں ہماری کوشش ہوتی کہ یہ کتاب نہ پڑھی جائے۔ لیکن استاد محترم کا فیصلہ تھا کہ "کتاب پڑھنی ہو گی کیونکہ اس میں کئی ملکوں کا تعارف ہے۔" بعد میں ہم دونوں محمود غزنوی کو ہندوستان پر سترہ حملے کرنے اور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب بننے پر خوب کوستے تھے۔ یہ دونوں تاریخی عہد ہمارے ہائی اسکول کے نصاب کا حصہ تھے۔ اس کے باوجود مصداق حسین نے تاریخ میں ماسٹرز کیا۔

زمانہ قدیم سے دریائے آمو بہت مصروف آبی گزرگاہ تھی۔ اس زمانہ میں پاسپورٹ اور ویزا نہیں تھے۔ دریا پار کرنے پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بھی عام تھی۔ اس گزرگاہ نے وہ بدنصیب قافلے بھی دیکھے ہیں جن میں مفتوحہ عورتوں کے گلے میں طوق پڑے ہوتے اور کسی مرکزی میدان میں ان کی خرید و فروخت ہوتی۔ حسین عورتیں ایک طرف اور عمر رسیدہ عورتیں دوسری طرف۔ یہ طوق در گلو خواتین ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف مسلسل سفر میں رہتیں۔

منگول سلطنت کے بانی خانہ بدوش تموچن کے چنگیزی لشکروں کے علاوہ گورگانی اور تیموری سپاہ کے لشکر اپنے خچّروں، گھوڑوں، اونٹوں پر سوار یا پیادہ (انفنٹری) دریائے آمو میں اترتے اور سال دو سال بعد دنیا کو تہ و بالا کر کے مال و دولت اور پردیس کی حسین عورتوں کو اپنے پہلو میں سجائے اسی راستے سے اپنے مرکز پر واپس پلٹتے۔

اب اس ٹیلے سے دریائے آمو کے دوسرے کنارے پر افغان سرگرمیاں نظر نہیں آتیں۔ فرینڈشپ برج یا دوستی پل سے نظر ٹکراتی ہے اور 'سوری' کہہ کر واپس آ جاتی ہے۔ یہ پل جنگ افغانستان (۱۹۸۹۔ ۱۹۷۹ء) کی عسکری ضرورت تھا۔ ان پابندیوں پر کمال الدین عبد الرزاق بن اسحاق سمرقندی اپنی قبر میں کروٹ بدلتے ہوں گے۔ یہ کیا ہو گیا برادر!

ترمذ اور دریائے آمو زمانہ قدیم سے بین الاقوامی تجارتی سرگرمیوں، قافلوں اور لشکریوں کے ذریعہ دنیا کے مذاہب اور عقائد کے برآمدات اور درآمدات کے سنگم پر واقع ہے۔ میں جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ رواداری، برداشت اور ذہنی پختگی کا دور تھا۔ تہذیب و ثقافت اور عقیدہ پر دریائے آمو کے دونوں کناروں پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ تمہارا دین تمہارا دین، میرا دین میرا دین۔ اس صلح پسندی کے مسلک کو اختیار کرنے کے بعد کسی مقامی، قومی اور بین الاقوامی سیاسی یا مذہبی 'لفڑے' کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس زمانہ کے تمام نوجوانوں اور شاہراہوں کا رخ ایران، توران، یونان اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی، ہندوستان کی طرف تھا۔ ہمارے زمانہ میں معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔

ہمارے ایشیائی نوجوان۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی اپنے بزرگوں، بھائیوں، بہنوں، عم زاد، دوست احباب اور صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کو پیچھے چھوڑ کر اپنی اور اپنے بچوں کے لئے ایک معیاری سماجی انصاف پر مبنی زندگی کی تلاش میں امریکہ، یورپ، کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرف وطنیت اختیار کر رہے ہیں۔ جانے والے اور پیچھے رہ جانے

والے ایک چھت کے نیچے پل کر جوان ہوئے تھے۔ اب ایک دوسرے کو یاد کر کے زندگی بسر کرتے ہیں۔ "بھیّا امریکہ سے آئے گا تو۔۔۔" بھیّا اور بیٹا سال میں ایک بار ہی آسکتا ہے۔ فاصلے، وقت اور مہنگے ٹکٹ راستہ روک لیتے ہیں۔

میرے عزیز! تم نے بھی یہی کیا تھا۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔ جناب شجاعت حسین اور محترمہ تعظیم فاطمہ کے گھر کراچی میں فرزند تولد ہؤا۔ نام عمران متانت حسین طے ہؤا۔ والدین کا تعلق درس وتدریس سے تھا۔ لہٰذا محنت سے پرورش اور تربیت ہوئی۔ میکینیکل انجنئرنگ میں گریجویشن کیا۔ سوئی سدرن گیس کمپنی میں چیف انجنئر کے عہدے پر تھے کہ ترکِ وطن کر کے ٹورونٹو (کینیڈا) آگئے۔

اس سے پہلے سِوِل انجنئر سید مزمل حسین زیدی اور سیدہ راشدہ خاتون زیدی کی بیٹی ماہ طلعت زیدی سے شادی ہوئی۔ ماہ طلعت زیدی، سید منور حسین زیدی کی نواسی ہیں۔ ماہ طلعت نے بھی خوب تعلیم حاصل کی ہے۔ ایم ایس سی، بی ایڈ، ڈپلوما کوالٹی کنٹرول فارماسیوٹیکلز۔ ولادت اپنے نانا کے گھر ہندو محلّہ، کوہاٹ شہر۔ ان دنوں ہمارے چھوٹے ماموں جان حافظ سید سعید احمد زیدی اور ماموں سید عبدالقدوس زیدی کوہاٹ چھاؤنی میں رہتے تھے۔ چھاؤنی کے سرکاری مکان میں ممانی جان (ہاجرہ خاتون دخترِ سید منور حسین زیدی) ان دونوں کے بچّے اور میرے عم زاد عذراء، طارق سعید، خالد سعید اور آصف سعید ماموں جان کے ساتھ رہتے تھے۔ آلودگی سے پاک کھلی جگہ میں سب لوگ بہت خوش تھے۔ اب کسی کے سامنے کوہاٹ کا نام لیں تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ خود کش بمباروں نے کوہاٹ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

اب سے چند برس پیشتر ہمارے خاندان کے دوست (پھوپھی جی یعنی کنیز فاطمہ کی والدہ کو ان سے بہت پیار تھا) کرنل عامر کوہاٹ چھاؤنی میں کسی یونٹ کے سربراہ تھے۔ عفّت نے اصرار سے بلایا۔ میں نہیں جاسکا۔ کنیز فاطمہ، عاتکہ اور سویلم گئے۔ عفّت کی میز بانی بھی مثالی ہے۔ ایک روز جمعہ کی نماز پڑھ کر آئے تو ٹی وی کے نجی چینلز پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ "کوہاٹ چھاؤنی کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے دوران خود کش بم دھماکہ۔" شہداء کی تعداد بتائی جارہی تھی جو بہت تھی۔ سویلم نے خیریت معلوم کرنے کے لئے ٹیلیفون کرنے شروع کیے۔ موبائل، پی ٹی سی ایل اور آرمی لائن۔ بڑی مشکل سے کرنل عامر سے رابطہ ہؤا اور فیملی کی خیریت معلوم ہوئی۔ لیکن میں جس زمانہ کی بات کررہا ہوں وہ پرامن دن تھے۔ درّہ آدم خیل، نیچے اتر کر جنگل خیل کی بستی، اس سے آگے کوہاٹ شہر اور چھاؤنی، کوہاٹ۔ بنّوں روڈ پر واقع بستیوں میں میرے بہت سے دوست رہتے تھے۔ میں، ماموں جان اور ان کی فیملی کی محبت میں جاتا تھا۔ دوستوں کو پتہ چلتا تو وہ کنگ گیٹ کے سامنے ریستوراں میں جمع ہو جاتے۔ تین چار گھنٹے کی ادبی نشست ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اسی کنگ گیٹ کے سامنے والے ریستوراں میں احمد فرازؔ کے ساتھ شام منائی گئی۔ احمد فراز کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ یہ بات مجھے احمد فراز کے والد سید محمد شاہ برق نے بتائی تھی۔ برق صاحب خود شاعر تھے۔ برق کوہاٹی تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ کبھی کبھی میں احمد فراز کو تنگ کرنے کے لئے دونوں کو ایک ساتھ ریڈیو مشاعرہ میں مدعو کرلیتا تھا۔ پہلے تو تقدیم اور تاخیر کا مسئلہ ہوتا تھا۔ باپ پہلے پڑھے یا بیٹا؟ دوسرا مسئلہ احمد فراز کی چیختی چلاتی عاشقانہ شاعری کا تھا۔ تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا۔ دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں۔ ان دنوں ہماری سماجی قدریں بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ احمد فراز اپنے باپ کے سامنے اس طرح کے اشعار پڑھنے سے شرماتے تھے۔ مجھے اس حرکت سے باز رکھنے کے لئے احمد فراز کو بہت جتن کرنے پڑتے تھے۔ کیونکہ یہی کاروائی میں نے اباسین آرٹس کونسل کے مشاعروں میں متعارف کرادی تھی۔ برق صاحب سادہ لوح انسان تھے۔ وہ خوش تھے کہ ان کا بیٹا بہت مقبول شاعر ہے۔ لیکن احمد فراز گھبراتے تھے۔ باپ بیٹا برابر کی نشستوں پر بیٹھتے تھے۔ باپ کے احترام میں فراز کا ہاتھ سگرٹ کا پیکٹ نکالنے کے لئے بار بار جیب کی طرف جاتا اور خالی واپس آتا۔ جب ہمیں ترس آتا تو ہم پرچی بھیجتے "سیکریٹری کے کمرے میں فون آیا ہے۔" وہ کمرہ میں آتے تو ہم قہقہہ لگاتے۔ احمد فراز جھینپ جاتے۔ دو تین سگرٹیں پھونک کر واپس چلے جاتے تھے۔

کنگ گیٹ برٹش راج میں بنا تھا۔ اس دروازہ سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ دروازہ کے دونوں طرف پتھر کی کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ گویا سپاہی یہاں بیٹھیں اور آنے جانے والوں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھیں۔ کنگ گیٹ میں داخل ہونے کے بعد دونوں طرف دوکانوں کا سلسلہ چلتا تھا۔ شروع میں ہی میرے ایک شاعر دوست کی کیسٹ کی دوکان تھی۔ ان کی دوکان پر ہر وقت اردو، پشتو یا ہندکو کے ایک دو شاعر بیٹھے رہتے تھے۔ دوکان کا "چھوٹا" سامنے چائے کے ہوٹل سے چائے اور قہوہ (سبز

چائے لاتار ہتا تھا۔ یہ بہت لمبا بازار تھا۔ دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گلیوں کے لئے راستے بنے ہوئے تھے۔ یہ محلّے تھے۔ نانے منوّر حسین کا مکان ہند و محلہ میں تھا۔ ماموں جان کے ہمراہ دو تین بار اس مکان میں گیا ہوں۔ اچھا مضبوط بنا ہوًا کشادہ مکان تھا۔ اس زمانہ میں عمر اور رشتوں میں چھوٹے اپنے بزرگوں سے ملاقات، سلام کرنے اور دعائیں لینے جاتے تھے۔ میں نے ہمیشہ اس اخلاقی قدر پر عمل کیا ہے۔ کوہاٹ میٹھے امرودوں اور بٹیروں، خرگوشوں کے شکار کے لئے مشہور تھا۔ پراچہ خاندان میں احمد پراچہ سے مراسم تھے۔ یہ افسانے لکھتے اور ایک اخبار نکالتے تھے۔

کنگ گیٹ کا ایک واقعہ سنا کر اصل موضوع پر واپس جاؤں گا۔ اہل کوہاٹ نے فیصلہ کیا کہ کنگ گیٹ کے سامنے والے ریستوراں میں احمد فراز کے ساتھ شام منائی جائے۔ احمد فراز کا فون آیا: "چلو گے ؟" میں نے پوچھا اور کون جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور محسن احسان تمہارے پاس آرہے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اپنے باس کو اطلاع دی، 'ادبی ٹیم' سے کہا دفتر کی گاڑی لے جائے اور کور یج کرے۔ سیکریٹری کو بتایا کہ مہمان آنے والے ہیں انہیں چائے بسکٹ اور باتوں میں مصروف رکھے۔ میں گھر گیا اور آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر آگیا۔ واپس آیا تو سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم لطیفے کہتے سنتے کنگ گیٹ پہنچے۔ بہت شاندار تقریب ہوئی۔ کھانا اس سے بھی اچھا تھا۔

کنگ گیٹ کی کرسیوں کے ساتھ پان کا ایک کھوکھا تھا۔ ہم لوگ جب بھی کوہاٹ آتے یا آگے جاتے ہوئے گزرتے تو کھوکھے سے پان کھاتے اور حسب خواہش پڑیاں بندھوا لیتے۔ فارغ بخاری تمباکو کھاتے تھے۔ ہم لوگ سادہ پان کھاتے تھے۔ میں اسلام آباد آیا تو تمباکو والا پان کھانا شروع کیا۔ احمد فراز 'اکادمی آف لیٹرز' میں تھے۔ پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ان کا مصرعہ جواب میں پڑھا: نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں۔ میں تمباکو والے پانوں کے علاوہ تقریباً پینتالیس سگرٹ روز پیتا تھا۔ کئی سال بعد خاندان کے شدید دباؤ میں دونوں سے ترک تعلق کیا۔ لیکن میری وفاداری کا حال یہ ہے کہ دونوں اب بھی یاد آتے ہیں۔ ہم لوگ اپنی سرکاری یا نجی گاڑیاں بھی اس کھوکھے کے سامنے کھڑی کرتے اور کھوکھے والے کو خبردار کرتے "خیال رکھنا۔" جواب میں کھوکھے والا پیشانی پر ہاتھ لگا کر سلام کرتا۔ اس کے منہ میں پان بھرا ہوتا تھا۔ درہ آدم خیل (آفریدی قبائل) کا قبائلی علاقہ کنگ گیٹ سے سات آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ فقیروں کا بھیس بنائے گاڑیاں چوری کرنے والے اس علاقہ میں گردش کرتے رہتے تھے۔

کھوکھے پر پہنچے تو احمد فراز نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا، "میں تھک گیا ہوں، تم پان بنوا لاؤ۔" فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور محسن احسان نے ان کی تقلید کی۔ پان بنوانے میں کچھ دیر لگی۔ واپس آیا تو فارغ بخاری زور زور سے احمد فراز کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ قریب ہی آدھے درجن گداگر کھڑے تھے۔ ایک طرف کھڑے ہوئے محسن احسان زیر لب مسکرا رہے تھے۔ رضا ہمدانی بہت سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ رضا اور فارغ آپس میں برادر نسبتی بھی تھے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی مشترک ہوتی تھیں۔

اس وقت فارغ سے ''بات کرنی'' 'خالی از خطر' نہیں تھی۔ انہیں جلدی غصہ آتا اور دیر سے اترتا تھا۔ لیکن دل کے صاف تھے۔ اردو دنیا کے ادبی حلقوں میں ان کا بہت احترام تھا۔ میں نے محسن احسان سے پوچھا، "کیا ہوًا؟" ان کی زیر لب مسکراہٹ سارے چہرے پر پھیل گئی۔ اپنا منہ میرے کان کے قریب لائے اور بولے: "یہ جو۔۔۔ فراز ہے موقع محل دیکھے بغیر شرارت کرتا ہے۔ فقیر ہمیشہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ ایک فقیر آیا، فراز نے پیسے دے دیے۔ دوسرا آیا، فراز نے اسے بھی پیسے دے دیے۔ اتنے میں تیسرا فقیر آگیا۔ فراز گاڑی سے باہر آگیا۔ فقیر سے کہا تمہارے جتنے لوگ یہاں جمع ہیں سب کو بلا لو۔ سیکنڈوں میں ۲۰۵۔ ۲۱۵۰ فقیر جمع ہو گئے۔ انہوں نے اپنی کار کی ڈکی (ٹرنک) کھولی۔ گداگروں کو قریب بلایا اور انہیں ڈِکی میں رکھی ہوئی کتابیں تقسیم کرنی شروع کیں۔ گداگر کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور واپس ڈِکی میں پھینک کر چلے جاتے۔ "یہ کتابیں فارغ بخاری کا نیا شعری مجموعہ تھا جو وہ کوہاٹ کے احباب کو تحفہ میں پیش کرنے کے لئے لائے تھے۔ گداگر کتاب لے کر پچھلی نشستوں پر بیٹھے محسن، رضا اور فارغ کے پاس آتے اور کتاب سامنے کرکے بخشش طلب کرتے۔ یوں فارغ بخاری کو اس شرارت کا علم ہوًا۔ انہوں نے کار میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور محسن نے ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ وہ عمر میں ہم سب سے بڑے تھے۔ مشکل سے کار میں بیٹھے۔ ایک گھنٹہ کا واپسی سفر مشکل حالات میں ختم ہوًا۔ احمد فراز کے لطیفوں پر کوئی نہیں ہنسا۔ مبادا فارغ بخاری پھر ناراض ہو جائیں۔ بعد میں پشاور کے ادبی حلقوں میں مشہور ہوًا کہ "فارغ کا نیا مجموعہ کلام گداگر بھی قبول نہیں کرتے۔" اس پر تو فارغ بہت سیخ پا ہوئے۔

عزیز من! یہ قصہ میں پہلی بار تحریر کر رہا ہوں۔ کوہاٹ، عزیزہ ماہ طلعت کی ولادت کا شہر ہے اس لئے تحریر کا یہ حصہ ان کی نذر ہے۔ میں نے کوہاٹ کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر مجھے بہت عزیز تھا۔ اب چھوٹے ماموں جان حافظ سید سعید احمد زیدی (بی اے، بی ٹی علیگ) کی وجہ سے اکثر یاد آتا ہے۔ وہ گنجِ گرانمایہ جنگل خیل سے چھاؤنی میں داخل ہوتے ہوئے سڑک کے کنارے دائیں ہاتھ پر قبرستان میں محوِ خواب ہے۔ میں پشاور سے کوہاٹ آتا یا بنوں، ٹانک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان جاتا تو سڑک پر گاڑی رکنے کو کہتا۔ نیچے اتر کر قبرستان کی دیوار کا سہارا لیتا، فاتحہ پڑھتا اور اللہ میاں سے کہتا اس عظیم آدمی نے ہمیں سہارا دیا تھا تو اس کا سہارا بن جا۔ اس قصہ میں ایک زندگی شروع ہوتی ہے۔ دوسری زندگی ختم ہوتی ہے۔ سلسلہ روز و شب۔۔۔ اب واپس اپنے موضوع کی طرف۔

سادات بجنور کے نوجوانوں کی اکثریت اعلیٰ تعلیم، اخلاقی اقدار کی پاسداری، جدوجہد اور خود کو اجنبی ماحول میں ڈھالنے کے لئے مشہور ہے۔ میرے عزیز! کینیڈا آتے ہی تم نے سافٹ وئر ڈیویلپمنٹ برائے بایوانفار میٹکس کے کورسز کیے۔ نئی دنیا میں فکر معاش کے ساتھ اپنا شجرہ نویسی کا شوق بھی پورا کیا۔ لیپ ٹاپ سنبھالا اور شجرہ شجرہ کھیلنا شروع کیا۔ نتیجہ میں ایک عدد نسب نامہ لکھ لیا۔ یہ کام دو چار روز میں نہیں ہوا۔ پندرہ سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ جس نے سنادانتوں میں انگلی دی۔ نیا ملک، معاشی مسابقت اور آلِ سید السادات کے نسب کی تحقیق۔ شاباش عمران متانت حسین! تم نے زندگی کے عطیہ سے خوب انصاف کیا۔ اکیسویں صدی کی جدّت کے ساتھ تم نے جناب غنی حیدر اور حافظ عبدالرشید ندوی کے کام کو اوج ثریا تک پہنچایا۔ اس کتاب میں صرف شجرہ نہیں ہے۔ ہماری دلچسپی کا بہت سامان ہے جو شاید پہلی بار ہمارے سامنے آیا ہے۔ اسلاف کے ذیل میں تاریخی شخصیات، مشاہیر اور کرم فرماؤں کا ذکر ہے۔ کچھ تصویریں ہیں۔ اعتراف کے عنوان سے تمہارا اپنا مضمون ہے۔ مناجات کمالیہ بھی شامل ہے جو ہمیں فارسی کے کلاسیکی ادب کی یاد دلاتی ہے اور فارسی (جس میں ہمارا اخلاقی ادب محفوظ ہے) سے بے رخی اختیار کرنے پر کچوکے لگاتی ہے۔ "کمالِ حسینی بسا جرم دارد۔ تو ئی عفو کن یالطیفاً خبیرا۔"

عام طور سے عربوں کے نام کے چار حصے ہوتے ہیں۔ ولادت کے موقع پر رکھا گیا نام۔ باپ کا نام۔ دادا کا نام۔ حرف جار / حرف ربط انہیں الگ کرتے ہیں۔ مثلاً بن، ابن یا آل۔ ان سے مراد بیٹا ہوتا ہے۔ محمد بن عبداللہ، محمد عبداللہ یا محمد ابن عبداللہ۔ عبداللہ کی بجائے ابو محمد بھی کہہ سکتے ہیں۔ عربی میں ابو باپ کو کہتے ہیں۔ کبھی ملک یا شہر کا نام بھی ہوتا ہے جیسے العراقی، البغدادی وغیرہ۔ یہ وضاحت ضروری تھی۔ کیونکہ نسب نامہ کے آغاز میں اسی طرح کے نام ہیں۔

عمران متانت حسین (رونی) کے سامنے قلمی شجرہ نویسی میں پیشروؤں کے تین ماڈل تھے۔ (۱) جناب عابد حسین مرحوم۔ (۲) جناب غنی حیدر مرحوم۔ (۳) جناب حافظ عبدالرشید زیدی ندوی مرحوم۔ قبلہ حافظ عبدالرشید زیدی ندوی کے مرتّبہ / مصنّفہ شجرہ کی خاص بات یہ تھی کہ کتاب میں صفحہ وار ناموں کی فہرست شامل تھی۔ لیکن عین (قدیمی دستور کے مطابق) صرف مرد حضرات کا ہی ذکر تھا۔ عمران متانت حسین نے یہ امتیاز ختم کیا۔ عمران کے مرتّبہ / مصنّفہ کے نسب نامے میں بھی ناموں کی فہرست موجود ہے۔ لیکن اس میں یہ جدّت ہے کہ ہر شخصیت کا ایک (عددی) نمبر ہے۔ لہٰذا ہم نام افراد کی تفریق میں سہولت ہو گئی ہے۔ شجرہ نویسی کے موضوع پر میرے محدود علم کے مطابق سادات (نگینہ، نہٹور، نجیب آباد، سیوارہ اور شیر کوٹ وغیرہ) کے شجرہ نویسوں میں عمران متانت حسین (رونی) منفرد نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جدید ٹیکنالوجی کو بہت ذہانت (اور مہارت) سے استعمال کیا ہے۔ ماضی میں یہ ٹیکنالوجی موجود ہی نہیں تھی۔ اس ٹیکنالوجی کی ضمنی شاخ رابطوں کے لئے تھی۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

بھائی کموڈور (ر) سید محمد خورشید عالم زیدی نے ریٹائرمنٹ سے قبل ہی شجرہ نویسی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ان کو بھی کمپیوٹر کے استعمال میں مہارت تھی۔ خورشید بھائی سے میری پہلی ملاقات بھی اسی پس منظر میں ہوئی تھی۔ ان دنوں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ مردم شماری کرنے والوں کی طرح اپنا لیپ ٹاپ اٹھائے گھر گھر جا کر خاندان کے افراد کی تصدیق کر رہے تھے۔ تصدیق کرنا اور مستند بات کرنا ہم اہل سادات کو اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے محمد رسول ﷺ کی احادیث کی گواہی لینے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کرتی تھی۔ جہاں تک شجرہ کا تعلق ہے تو اہل عرب نسب کے بارے میں بھی بہت حسّاس ہیں۔ ڈیٹا جمع کرنے کے اس کام میں بھائی خورشید عالم زیدی نے اپنی مصروف زندگی کے بیس قیمتی سال لگائے۔

اس زمانہ میں ہم کئی لوگ 'آل سادات' کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں انٹرنیٹ پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ میں نسب نامہ کے ذیل میں کہتا تھا کہ صرف نہٹوری سادات کا ڈیٹا جمع کرنے سے نسب نامہ مکمل نہیں ہوگا۔ میں متعلقہ حلقوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوا کہ نہٹوری سادات کی زوجیت سیوہارہ، نگینہ، نیندڑو، نجیب آباد شیر کوٹ، تاج پور، چاند پور حتّٰی کے مراد آباد تک میں ہے۔ اس لئے نسب نامہ کا دائرہ وسیع ہونا چاہئے۔ میں یہ بھی کہتا تھا کہ سادات سے باہر ہونے والی زوجیت کو بھی شجرہ میں شامل سمجھنا چاہئے۔ سید غیور حسین زیدی اور سید لقا احمد زیدی ہماری نجی ملاقاتوں میں اس تجویز کی تائید کرتے تھے۔ برادرم مصداق حسین زیدی کی خواہش بھی یہی تھی۔ ان کے ٹیلیفون اور ای میل آتے رہتے تھے۔ بھائی خورشید عالم زیدی اور عزیزم عمران متانت حسین نے فہم وفراست اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس تجویز کو قبول کیا۔ چنانچہ اب جو نسب نامہ مرتّب ہوا ہے وہ خالص اسی بنیاد پر ہوا ہے اور اس میں ہر خاندان موجود ہے۔ **میرے حساب سے نسب نامہ سادات بجنور سید السادات کا پہلا نمائیندہ نسب نامہ ہے۔**

عمران متانت حسین کے سامنے چوتھا ماڈل برادرم کموڈور (ر) سید محمد خورشید علام زیدی تھے جو ایک طرف ڈیٹا جمع کر رہے تھے، گزشتہ ڈیٹا کو 'اپ ڈیٹ' کر رہے تھے، اس ذخیرہ کو اپنے انداز میں لکھ رہے تھے اور دنیا کے ہر گوشے سے موصول ہونے والے خطوط کے جواب دے رہے تھے۔ "آپ نے اپنے اجداد کے بارے میں جو اشارے لکھے ہیں ان کے مطابق آپ کا شجرہ درج ذیل ہے۔" از راہ عنایت مجھے ان خطوط کی نقل بھیجتے تھے۔ انہوں نے انتھک کام کیا ہے۔ عمران متانت حسین ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہم آپس میں ڈیٹا کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔" انسپائریشن اور بزرگانہ حوصلہ افزائی کے لئے "جائے استاد" ہمیشہ خالی رہتی ہے۔

نام ونسب کی تحقیق وجستجو اور شجرہ قلمبند (کمپیوٹرائزڈ) کرنے کا کام صرف ایسے دور اندیش لوگ کرتے ہیں جن کے پاس وِژن ہوتا ہے اور جو خاندان کے ہمدرد اور مورث اعلی کے عقیدت مند ہوتے ہیں۔ ورنہ کون اس کام میں سر کھپاتا ہے۔ یہ سعادت صرف بازوؤں سے نہیں ملتی۔ اس کے لئے جذبہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ یہ دیدہ ریزی اور لڑی میں موتی پرونے کا کام ہے۔ اس شجرہ کے مصنّف اور مرتّب عمران متانت حسین نے یہ کام بہت محنت اور دیانت داری سے کیا ہے۔ کتنے ماہ وسال انہوں نے گمشدہ موتیوں کو تلاش کرنے، مخصوص کسوٹی پر ان کی نسبت پرکھنے اور تسبیح کے دانوں کی طرح انہیں ایک لڑی میں پرونے میں بسر کیے ہیں۔ شجرہ یا نسب نامہ کی تحقیق، ترتیب اور تصنیف میں آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں۔ پتّہ مارنا پڑتا ہے۔ اگر ایک طرف یہ کتاب آلِ سادات کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے عمران متانت حسین کا تحفہ ہے تو دوسری طرف اپنے بزرگوں کے احترام اور ان سے سچّے عشق کی کہانی ہے۔ شاید فیض کا یہ شعر میرے اس بیان کی مزید وضاحت کرے: وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے۔ اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو۔

برج نارائن چکبست کو آپ جانتے ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کشمیری تھے۔ لکھنؤ میں باپ دادا کے وقت سے رہتے تھے۔ چکبست نے اپنی تصنیف میں پچھی رام سرور کے بارے میں ایک مضمون شامل کیا ہے۔ یہ مضمون انہوں نے کشمیر درپن کے لئے لکھا تھا اور ستمبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ دیکھیے کیا لکھتے ہیں: "۔۔۔ بزرگوں کے حالات یادگار کے طور پر یا تبرکاً قلمبند کر کے رکھنا ایشیائی تہذیب کا حصہ نہیں۔" گویا آل سادات کے شجرہ نویسوں نے روایت کے بت توڑے ہیں۔۔۔

عزیزو! اس کتاب میں ایک کہکشاں ہے جو دامن دل کو کھینچتی رہتی ہے۔ اس نورانی کہکشاں میں آل زید شہیدؓ کے سارے ستارے صدیوں سے جگمگ کر رہے ہیں۔ یہ روشن کہکشاں اوّل مدینۃ النبی کے افق پر نمودار ہوئی تھی۔ ساکنانِ مدینہ ان ستاروں کو رشک سے دیکھتے، ان کی باتیں سنتے، اپنی قسمت پر ناز کرتے اور خانوادہ رسول کو عکس رسول قرار دیتے تھے۔

"غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست۔" "تاریخی تذکروں میں لکھا ہے کہ سیاسی حریفوں اور اقتدار کے آرزومندوں نے آلِ زید شہیدؒ کو کہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دیا۔ زید شہیدؒ بن امام زین العابدینؑ کی اولاد تتّر بتّر ہو گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا چل پڑا۔ سادات کے آفتاب عالمتاب کو گہن لگا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب انقلاب آتے ہیں تو یوں ہی ہوتا ہے۔ اہل حق کو دربدر ہونا پڑتا ہے۔ مدینہ سے کوفہ، کوفہ سے جارجیا، کوہستان البرز، طبرسطان وگیلان اور ترمذان کے نئے وطن بنے۔ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔"

یہ مسافت طے کرتے ہوئے کئی ستارے بجھ گئے۔ کوئی یہاں، کوئی وہاں۔ کئی نسلیں گزرنے کے بعد سید السادات کی اولاد میں سید کمال الدین ترمذیؒ بن سید عثمان ترمذیؒ نے اگست ۱۱۸۰عیسوی (ایک تذکرہ میں ۱۱۹۰ء ہے) میں فیصلہ کیا:

"چل اٹھ! ترمذ سے رخصت لے۔ اب ساکنان خطہ ہندوستان کو اسلام سے آشنا کر اور ان تک اللہ کا آخری پیغام پہنچا۔"

اس زمانہ کے بزرگ صرف منصوبے نہیں بناتے تھے۔ ان منصوبوں پر عمل بھی کرتے تھے۔ عزیزو! تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ کنار فرات سے اکھاڑے جانے والے خیمے (ترمذ میں عربوں کے آنے کے بعد) جواب تک ترمذ (ہمارے زمانہ کا ازبکستان) میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، ایک بار پھر عازم سفر ہوئے۔ "کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔" اس دفعہ ان کا رخ جانب ہندوستان تھا۔ عزم تھا کہ ایک نئی اسلامی برادری قائم کریں گے۔ میر سید کمال الدین ترمذیؒ جانب ہند چل پڑے۔ ضلع بجنور (اور روہیل کھنڈ) کی طرف یہ آلِ سید السادات کا پہلا قدم تھا۔ میر سید کمال الدین ترمذیؒ نے اپنے والد، عزیز و اقارب، دوست احباب اور ترمذ کی بستی پر الوداعی نظر ڈالی۔ "خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔" الفاظ کی یہ تصویر ملاحظہ فرمائیے:

"ایک خچّر پر خیمہ لادا، ایک مشکیزہ، کتابوں کا بستہ، جاء نماز، تسبیح اور تلوار۔ جیجوں پار کر کے بلخ پہنچے۔" (کارِ جہاں دراز ہے از اردو فکشن کی خاتون اوّل بی بی قرۃ العین حیدر)۔ میری جانب سے یہ اضافہ قبول کیجیے کہ نسّاب اور نسب نامہ ہمراہ۔"

ترمذ جیجوں یا آمو دریا کے کنارے اُمّ البلاد بلخ سے تقریباً" پچاس میل کے فاصلہ پر تھا۔ بخارا سے بلخ جانے والے قافلے اور بلخ سے بخارا جانے والے قافلے صرف مالِ تجارت لے کر نہیں آتے جاتے تھے۔ تینوں شہروں کو ایک رنگ میں رنگ کر گزرتے تھے۔۔ دریا ایک نام تین بلکہ چار تھے۔ یونانیوں نے آکسس ریور کہا۔ عربوں نے جیجوں اور ماور اُلنہر کہا اور مقامی لوگوں نے آمو دریا کہا۔ لیکن جیجوں، نام پر کئی دیگر ملکوں کا بھی دعوٰی ہے۔ یہاں ایران توران کی سرحد گلے ملتی تھی۔

ترمذ میں علماء اور صوفیاء گلی گلی عمامے، چوغے اور جبّے پہنے مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں لپک جھپک آتے جاتے نظر آتے۔ کتنی ہی زبانیں سننے کو ملتیں۔ بارہویں صدی عیسوی کا ترمذ چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ترمذ کی اصل رونق کاروانوں اور لشکروں سے تھی۔ مسجدوں، مدرسوں اور تجارتی مرکزوں میں خوب چہل پہل رہتی۔ بستی سے ہٹ کر ایک طرف کو چوکور کاروان سرائے تھی۔ اس کے چار دروازے بنائے گئے تھے۔ دنیا کے ہر خطے سے آنے والے قافلے مختصر قیام کے لئے ان چاروں دروازوں سے گزرتے۔ ان دروازوں پر تعیّنات سرکاری کارندے ان سے آمد و رفت ٹیکس وصول کر کے انہیں کاروان سرائے میں داخلہ اور قیام کا پروانہ دیتے تھے۔ کاروان سرائے کے صحن میں ایک طرف کو سواری اور مال برداری کے جانور، گھوڑے، اونٹ اور خچّر باندھے جاتے تھے۔ ان جانوروں کے لئے ہر وقت وافر چارہ موجود رہتا۔ کاروان سرائے کے طول و عریض صحن کے ساتھ ہی چاروں طرف راہداریوں اور برآمدوں کے پیچھے رہائشی کمرے اور حمام تھے۔ غسل کرو، گرد سفر اتار و اور تازہ دم ہو جاؤ۔ ایک طرف کو مطبخ اور سرائے بازار تھا۔ ہر قافلہ کے ساتھ اپنے طبیب ہوتے تھے۔ تفریح کا سامان بھی موجود تھا۔ برآمدوں میں رکھی ہوئی چارپائیوں اور چوبی تخت پر اوّل شب داستان گو اور موسیقار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور صلہ پاتے۔ نیم تاریک گوشوں میں ترک غمزہ زن موجود رہتے۔ آرام کرنے کے بعد کاروان سرائے میں مقیم مسافر اپنے ساتھ لایا ہؤا سامان فروخت کرتے اور مقامی تاجروں سے سمرقند و بخارا کا مال (ریشم وغیرہ) خرید کر نئی منزلوں (منڈیوں) کی جانب روانہ ہو جاتے۔ دنیا آہستہ آہستہ جدید دور میں داخل ہوئی۔ تین صدیاں قبل مسیح میں سکندر نامی فاتح بھی اس خطہ میں آیا، فتح کیا اور یونانی حسن کے تیکھے نقوش چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ دنیا اسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ تہذیبیں اور لشکر کسی ایک جگہ مستقل ڈیرے ڈال دیں تو سڑاند آنے لگتی ہے۔ دونوں کو آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔

المختصر! میر سید کمال الدین ترمذیؒ کا سادات قافلہ اپنے پر امن اسلامی مشن کی تکمیل کے لئے سوئے ہند روانہ ہؤا۔ اپنے طویل سفر میں اس جگمگاتی مقدس کہکشاں نے آفات کا مقابلہ کیا۔ صدمے اٹھائے۔ لیکن سفر جاری رکھا۔ منزلیں طے کرتے رہے۔ دریا، پہاڑ، ندی، نالے، درّے، میدان اور جنگلات عبور کیے۔ موسموں اور ہر نوع

کے خطرات کا مقابلہ کیا۔ بلخ، غزنی، دریائے اٹک کے اس پار پنجاب کے شہروں اور مرکز لاہور سے گزرتے ہوئے ہندوستان میں ہریانہ ندی کے کنارے پہنچے۔ یہ خوب سرسبز وشاداب علاقہ تھا۔ اس کے نواح میں تھانیسر اور جوّار میں قصبہ کیتھل کا موضع سیلہ گڑھ تھا۔ ایک تالاب کے کنارے (فرات یاد آتا ہوگا) مسافروں نے گھوڑوں اور خچّروں کی لگامیں کھینچیں، بارِ سفر اتارا اور ایک نیا پڑاؤ ڈالا۔ اس مقام کا حسن فطرت سید کمال الدین ترمذیؒ اور ان کے ساتھیوں کو بہت پسند آیا تھا۔ اس مقام سے آلِ سید السادات کے نسب کا ایک نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ اپنی سہولت کے لئے ہم اسے ہندوستانی دور کہہ سکتے ہیں۔

یہ تاریخی مقام ازمنہ قدیم میں کوروں کھشتیروں کے درمیان ہونے والی خوں ریز جنگ کے لئے مشہور ہے۔ یہ جنگ ہستناپور کے تخت کے لئے لڑی گئی تھی۔ ہندؤں کی مقدس کتابوں میں اسے مہابھارت کی جنگ کا میدان کہا گیا ہے۔ مورّخین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ سید کمال الدین ترمذیؒ کی سیلہ گڑھ میں آمد بارہویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہندوستان دم بدم شمال کے حملہ آوروں کی زد میں رہتا تھا۔ کبھی ایک خاندان کا لشکر چڑھ دوڑتا اور کبھی دوسرے خاندان کا لشکر چڑھائی کر دیتا۔ ہندوستان کو کنگلا کر کے واپس چلے جاتے۔ میر سید کمال الدین ترمذیؒ اور ان کے رفقاء ایک غیر محفوظ خطے میں سکونت اختیار کر رہے تھے۔ بعد میں یہ قصبہ خوب پھلا پھولا۔ لیکن کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ کجا ترمذ اور کجا کیتھل۔ چہ نسبت۔۔۔!

سادات سیوہارہ، نہٹور، چاندپور، نگینہ، نجیب آباد، تاج پور، نیندڑو اور شیر کوٹ بلکہ جملہ سادات روہیلکھنڈ (یعنی ضلع بجنور) یاد رکھیں کہ ہندوستان میں ان کے جد کا پہلا وطن سیلہ گڑھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیتھل صوفیائے کرام کا مسکن بن گیا۔ جو سنتا وہ سلام کرنے حاضر ہوتا اور یہیں کا ہو جاتا۔ بعد میں برطانوی دور میں یہاں چھاؤنیاں بنیں۔ ان چھاؤنیوں کی ذمہ داری تھی کہ اگر شمال کے لشکر کسی طرح یہاں تک پہنچ جائیں تو ان کا 'سرمہ' بنا دو۔

آلِ زید شہیدؓ بن امام زین العابدینؓ کی ہندوستان آمد سے ذرا پہلے (گیارہویں صدی عیسویں) میں سید ابوالفرح الحسینی کی سربراہی میں آلِ سادات کا ایک قافلہ عراق کے شہر واسط سے افغانستان کے ایک شہر غزنی سے ہوتا ہوُا مظفر نگر (یوپی) پہنچا تھا۔ دراصل ان لوگوں کو محمود غزنوی نے غزنی آنے کی دعوت دی تھی۔ اس زمانہ کا عراق تہذیب وتمدّن کا گہوارہ تھا۔ غزنی میں واسطیوں کا دل نہ لگا۔ اپنی نئی منزل کی تلاش میں انہوں نے 'آتے جاتے' قافلوں کے مسافروں سے مشاورت شروع کی۔ ان لوگوں نے واسطیوں کو مظفر نگر کی راہ دکھائی۔ کہتے ہیں کہ سید ابوالفرح الحسینی کے بارہ فرزند تھے۔ چار فرزند اپنے خاندانوں کے ساتھ پٹیالہ کے گردونواح میں آباد ہو گئے۔ سید ابوالفرح الحسینی بھی خود کو آلِ زید شہیدؓ بن امام زین العابدینؓ بتاتے تھے۔ ان کے پاس ایک قدیمی شجرہ نسب بھی تھا۔ اس شجرہ نسب کو بادشاہوں اور رئوساء کو دکھاتے۔ وہ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیتے اور سادات بارہ کو رعایتوں پر رعایتیں دیتے چلے جاتے۔ بعد میں یہ لوگ بادشاہ گر بن گئے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ شجرہ بہت کارآمد چیز ہے۔ کبھی تو وہ کام کر کے دکھاتا ہے جو بڑے لشکر نہیں کر سکتے۔

واسطی شاخ مظفر نگر کے علاوہ نگینہ اور مہاراشٹر کے شہر ناگ پور میں بھی ہے۔ مہاراشٹر پہنچنے والے واسطی (سادات) میر عزیز صاحب تھے جو راجہ رگھوجی بھونسلے کے دربار میں منصب دار تھے۔ اس خاندان نے اس خطے میں اشاعت علم کا بہت کام کیا۔ اب بھی 'سادات بارہہ فاؤنڈیشن' کے نام سے ایک ایجوکیشنل ٹرسٹ چلا رہے ہیں۔

ہماری چچی نعیمہ (اہلیہ چچا سید اوصاف حسین زیدی) کے آباء واجداد کا تعلق سادات بارہہ مظفر نگر کی اس شاخ سے ہے جو شیعہ مکتب فکر کی نہیں ہے۔ اسی طرح سکھر کے ذوالفقار حسین، زوّار حسین اور انصار حسین کے والد جناب منشی ضمیر حسین کا تعلق بھی مظفر نگر کی سادات سے ہے۔ یہ لوگ بھی شیعہ نہیں ہیں۔ سکھر میں کئی واسطی خاندان رہتے تھے۔ اب ہم اپنے جد کی طرف آتے ہیں۔ رئیسہ پھوپھی کے سسرال میں بھی نگینوی واسطی سید تھے۔

آلِ زید شہیدؓ بن امام زین العابدینؓ کی نسل میر کمال الدین ترمذیؒ کی سرپرستی میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قلم اور کتاب سنبھالے (صاحبان سیف وقلم) اب کیتھل (مضافات کرنال اور پانی پت) کے آسمان پر جگ مگ کر رہی تھی۔ اگر تلوار (یا جدید اسلحہ) طاقت ہے تو قلم اور کتاب بھی طاقت ہیں۔ قلم گوید کہ من شاہ جہانم۔ سادات کیتھل اپنی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو یہ اشارہ دے رہی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ نسب میں اہل علم اور منصبداروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔

کیتھل اب ہر رنگ و نسل کے عوام کے لئے ایک پر کشش مقام بنتا جا رہا تھا۔ مقامی باشندے شوق اور رشک سے ان نووارد ترمذیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان ترمذیوں کے منہ میں حسب حیثیت (ترمذ کی ثقافت) ایک یا زائد سونے کے دانت چیخ چیخ کر اعلان کرتے "میں ترمذی ہوں۔" کیتھل کے مقامیوں سے حلیہ مختلف تھا۔ روز مرّہ کا معمول بھی مختلف تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے اللہ اکبر' کا بلاوا۔ عام اور سموری ٹوپیاں، عام اور سموری قبائیں، عمامے، دستاریں، سبز رومال، چوغے، چرمی جوتے، سلام، مصافحے، وضو اور ایک ہی صف میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے رکوع اور سجدے۔ مقامی لوگ کچھ فاصلہ پر کھڑے ہو کر حیرت سے دیکھتے "نظم و ضبط واہ واہ عجیب لوگ ہیں۔ دن میں پانچ بار ایک ہی جگہ جمع ہوتے ہیں۔" ناشتے اور کھانے کے وقت ہر خاندان اپنے خیمے یا قیام گاہ میں جمع ہوتا۔ کچھ خاندانوں میں مرد ایک طرف ہوتے۔ خواتین اور بچے اوٹ میں ہوتے۔ دستر خوان بچھائے جاتے۔ ترمذی سبزیاں اور پھل کھانے کا حصہ ہوتے تھے۔ دونوں نعمتیں یہاں بھی دستر خوان پر موجود ہیں۔ کلچر تبدیل ہونے میں زمانے لگتے ہیں۔ دو ونوں طرف کے خواتین و حضرات میں میل ملاقات کی خواہش نے انگڑائی لی۔ ایک دوسرے کے زیادہ مستعمل الفاظ سیکھنے لگے۔ سلام، نمستے، پائے لاگن۔ دوستیاں شروع ہوئیں۔ بچے ایک ساتھ کھیلنے لگے۔ عورتیں کسی خیمے کو آڑ بنا کر ایک ساتھ بیٹھنے لگیں۔ اشاروں میں ایک دوسرے کے لباس اور زیورات کی پسندیدگی کا اظہار ہونے لگا۔ مردوں میں ایک دوسرے کی زبان سیکھنے کا عمل جاری رہا۔ ٹوٹی پھوٹی ہریانہ کی مقامی زبان میں مقامی لوگوں کے سوالات کے جواب دینے شروع کیے۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا ارادہ ہے؟ کہاں جاؤ گے؟ مذہب کیا ہے؟ وغیرہ۔ جب کچھ بے تکلفی ہوئی تو اہل ترمذ، آل ید السادات نے نئے دوستوں کو دعوت بعام دی۔ یہ ان کا عرب کلچر تھا۔ یاری دوستی اس وقت پکی سمجھی جاتی تھی جب دونوں فریق ایک ہی دستر خوان پر مل کر کھائیں۔ اہل ترمذ نے کھانے کی دعوت دی۔ مقامیوں کی طرف سے جواب آیا کہ ہمسائے ہیں ساتھ رہ سکتے ہیں۔ کھانا پینا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ دھرم اجازت نہیں دیتا۔ اہل ترمذ پہلی بار چھوت چھات سے آشنا اور حیران ہوئے۔ رواداری کا مظاہرہ کیا۔ صرف اتنا کہا "تمہاری مرضی۔" لیکن باد مخالف نے بار بار ماحول کو جھلسایا۔ مقامی حکمراں شکوک و شبہات کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے۔ کسی نئی زمین پر پودے لگانا یا پاؤں جمانا آسان کام نہیں ہے۔

ذرا یاد کرو! ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں سرحد پار کرنے کے بعد پاکستان کے شہروں میں تمہارے باپ اور دادا کا سانس پھول گیا تھا۔ صرف مذہب ایک تھا۔ باقی سب کچھ نیا تھا۔ ادھر کیتھل میں سید یر کمال الدین ترمذیؒ کی تدبیروں سے اہل ترمذ نے کیتھل والوں کے دل میں جگہ بنالی۔

نووارد ان ترمذ کے قدم کیتھل میں جمے تو غوری اور غزنوی لشکروں کے ساتھ ترکمانیہ کے ترمذی اور بخاری قافلے جوق در جوق ہندوستان آکر آباد ہونے لگے۔ ماور ائُ النہر کے پار شور تھا "چلو ہندوستان چلو۔ ایں ملک خوب است۔ بسیار رنگ و بو۔ موسم را اعتبار نیست۔" اس کے بعد ہی یہ ترمذی اور بخاری تلاش معاش میں ہندوستان کے شہر و دیہات میں پھیلنے شروع ہوئے۔ جگہ جگہ ترمذیوں کے مقبرے اور تبلیغ کے قصّے۔ تبلیغ میں شدت نہیں تھی۔ حق بیان کر دیا ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ مذہب، عقیدوں اور مسلکوں سے کسی کو غرض نہیں تھی۔ حق بیان کر کے 'وما توفیقی الله بالله' کہتے اور معاش پر توجہ دیتے۔ یہ انڈو یورپ کی تہذیب کے۔ پروردہ لوگ تھے۔ زرتشتی، بدھ، عیسائی اور پتہ نہیں کون کون صدیوں تک ان کے ہم وطن تھے۔ عربوں کے ذریعے اسلام ۷۰۵ عیسویں میں ترمذ میں پہنچا تھا۔ طویل سفر کے بعد یہ حال تھا کہ لب خشک، بال بکھرے ہوئے، چہرہ و کپڑے غبار آلود، ہاتھوں میں تسبیح اور تلوار اور ہونٹوں پر قال، قال رسول الله۔ معاشرتی وقار ساتھ لائے تھے۔ البتہ چولے بدلنے لگے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ لیکن رشتے نہیں ٹوٹے۔ اخلاقی اقدار کو سینے سے لگائے رکھا۔

مجھے اور اہلیہ کنیز فاطمہ (ددھیال جیلانی اور ننھیال بخاری) کو باچہ کلے کے پہاڑی علاقہ میں (ترمذ میں پیدا ہونے والے) سید علی شاہ ترمذیؒ (المعروف پیر بابا) ولد سید قنبر (۱۵۰۲۔۱۵۸۳ عیسوی) کے مزار کی زیارت کا اعزاز حاصل ہے۔ صائمہ گود میں تھیں۔ خیبر پختون خواہ کے مقام باچہ کلے، ضلع بنیر (نواح سوات) میں پیر بابا کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ باچہ کلے اب سرکاری کاغذوں، پیدائش اور ڈومیسائل سرٹیفیکیٹ میں لکھا ملتا ہے۔ عوام پیر بابا کہتے ہیں تو سب سمجھ جاتے ہیں کہ باچہ کلے کہہ رہے ہیں۔ مزار پر ایک طرف کو بڑا سا جھولار کھا ہوا ہے۔ بے اولاد خواتین کثرت سے آتی ہیں اور جھولے کے قریب ہو کر منّت مانگتی ہیں: "پیر بابا! میری گود بھر دے۔" سید علی شاہ ترمذی المعروف پیر باباؒ ترمذ کے اسی شجر بار آور کی ایک شاخ ہیں جس سے ترمذ میں آلِ زید شہیدؓ ابن زین العابدینؓ پیوستہ تھی یا جس آسمان کا میر سید کمال الدین ترمذیؒ ایک ٹوٹا ہوا ستارہ ہیں۔ پیر بابا شاہ خراسان کے نام سے بھی معروف ہیں۔

مرقع سادات نہور (میگزین) کے کسی شمارہ میں بی بی مریم سواتی کا ذکر آیا ہے۔ اس کے مطابق بی بی سیدہ ام مریم کی ولادت (بنیر) سوات کی ہے۔ اور وہ سید بندے علی ترمذی کی تیسری زوجہ ہیں۔ جناب بندے علی صاحب کا انتقال ہو گیا تو وہ واپس بُنیر چلی گئیں اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دو بچے پیدا ہوئے۔ (۱) سید اکرام حیدر اور (۲) سعیدہ بانو۔ (اس موضوع پر ریسرچ کی ضرورت ہے)۔ اس حوالے سے جناب میر بندے علی ترمذی کے نسب کو پیر بابا کی قرابت داری کا اعزاز حاصل ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ میر بندے علی اصل میں بندہ علی تھے۔ کثرت استعمال سے دیسی روانی آگئی اور بندے علی ہو گئے۔ دیسیوں سے اختلاط کی وجہ سے ہی حروف تہجّی کی تختی میں دیسی حروف پ، ٹ، چ، ڑ، ژ، گ وغیرہ شامل ہوئے۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو طاقتیں ہوتی تھیں۔ (۱) بادشاہ یا راجہ جو عوام کے جسم و جان پر حکومت کرتے تھے اور جن کی زبان سے ادا ہونے والا ہر جملہ قانون ہوتا تھا۔ اور (۲) درویش، صوفی یا عارف۔ یہ عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ کسی اشتہار کے بغیر مخلوق ان کے پیچھے بھاگنے لگتی۔ رنگ، نسل، زبان اور قومیت کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ بادشاہتیں ختم ہوتی رہیں۔ درویش، صوفی اور عارف بعد از مرگ بھی دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ کیسی تعجّب خیز بات ہے۔ 'در راہ طلب غافل و دیوانہ یکی است۔'

اس پس منظر میں یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ صوفی ہندوستان پر آلِ زید شہیدؒ بن امام زین العابدینؒ بذریعہ سید کمال الدین ترمذیؒ اور ان کے گیارہ فرزندوں کی لازوال چھاپ ہے (صوفیوں کے بارے میں حوالہ کے لئے دیکھیے مصنّف شیخ محمد اکرام کی تصانیف ملاحظہ کیجئے)۔ باپ کی طرح ان سب کے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی (اور اپنے گھوڑے تیار رکھو۔ القرآن)۔ طاقت کے مرکز ان سے رابطہ میں رہتے تھے۔ کیتھل سے فیض آباد، احمد آباد (گجرات)، بنگال، بہار، آسام، قنّوج اور اپنے روہیل کھنڈ میں جدھر آنکھ اٹھاؤ اپنے یار کی تصویر اں ہیں۔ سید السادات آلِ زید شہیدؒ بن امام زین العابدینؒ کے فیوض برکات بہ معرفت میر سید کمال الدین ترمذیؒ ہندوستان کے ہر گوشے میں عام ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ روشن تاباں کہکشاں اپنے وارثوں کی شکل میں آج بھی منبع فیض ہے۔ اس کے سب سے بڑے مظہر ضلع بجنور کے قصبات اور شہروں میں زندہ و پائندہ ہیں۔

اگر زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے سیاسی مدبّروں میں برائے نام دانش موجود ہوتی تو وہ 'وہابی' اورنگ زیب عالگیر کی جگہ 'صوفی' دارالشکوہ کو تاج پہناتے اور ہندوستان کے تخت پر بٹھاتے۔ اگر یوں ہوتا تو ہندوستان میں کوئی مسلمان حکومت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہوتی۔ صوفیوں کی رواداری اور وسیع النظری کی چھتری تلے ہندوستان کے سب مذہب، عقیدے، فرقے اور مسلک امن وامان سے رہتے۔ لیکن مشہور قول ہے کہ جو بادشاہ کا دین ہوتا ہے وہی عوام کا دین ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے 'وہابی' شاہی مشیروں نے صوفی دارالشکوہ کو تخت وتاج کے قریب نہ آنے دیا۔ اورنگ زیب کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ سادات بارہہ کے سیدّوں نے جس کو چاہا تخت پر بٹھایا، جس کو چاہا تخت سے اتارا۔ موّرخین نے ان سیّدوں کو 'بادشاہ گر' کہا ہے۔ آلِ سّید السادات تخت وتاج سے بے نیاز تھی۔ ترمذیوں کی طرح واسط بدر ہونے والے بھی صاحبانِ اقتدار کے ستائے ہوئے تھے۔ دونوں کا درد مشترک تھا۔ دونوں کو مختلف ادوار میں اپنے آبائی وطن سے بیدخل ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔

۷۰۵ عیسوی اباد یس اور سامانیوں کا عہد تھا۔ آل سید السادات کے منتشر خاندان ترمذ میں جمع ہونے لگے۔ ترمذ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ چند ہزار نفوس پر مشتمل۔ لیکن تاریخ ڈھائی ہزار سال سے اس کے بطن میں سانس لے رہی ہے۔ چھے صدی ق م Achamendis کو ترمذ میں اب کوئی نہیں جانتا۔ ۳۲۹ ق م میں ترمذ پر سکندر اعظم (اعظم کا مطلب ہے بڑائی۔ سکندر نے دنیا کو پاؤں تلے روندا۔ یہ کون سی فخر کی بات ہے) کی یلغار بس تاریخ کی نصابی کتب تک محدود ہے۔ گریکو۔ باختر یہ سلطنت کے بانی Demetrius نے ترمذ کا نام دیمترس رکھا تھا۔ لوگ اب یہ نام سنتے ہیں۔ اوّل تو موّرخین کے علاوہ کسی کو یاد ہی نہیں ہے کہ ترمذ کبھی دیمترس تھا۔

تین سو سال ق م کے کشان دور میں ترمذ پر بدھ مت کی چھاپ ہے۔ دنیا سے بے زاری، کائنات اور زندگی کے بارے میں الجھے ہوئے بالوں کی طرح الجھے ہوئے فلسفیانہ سوالات (بدھ اپنے روحانی پیشوا کی پیروی میں سر اور داڑھی کے بال مونڈتے تھے اور زعفرانی کے ڈھیلے ڈھالے لباس پہنتے اور کشکول میں کھاتے ہیں۔ جب رنگوں کے پاؤڈر نہیں ہوتے تھے تو وہ اپنے کپڑے سبزیوں اور درختوں کی چھال میں رنگتے تھے۔ جملہ معترضہ)۔ ترمذ کے مٹیالے ماحول میں بھاگتے دوڑتے بھکشو، علم کی جستجو میں سرگرداں بھکشو۔ یہ بدھ بھکشو اپنے گھٹے ہوئے یا منڈے ہوئے سروں اور مخصوص کلچر کے ساتھ ماوراُلنہر کے پار افغانستان کے شہروں، ٹیکسلا اور پشاور میں بھی نمایاں

السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار

سجادہ نشین

آستانہ عالیہ حضرت قبلہ مخدوم السید ریاست حسین زیدی

الحسینی رسولدار

محلہ علی پور پاکپتن شریف

وٹس ایپ نمبر-03007579114

تھے۔پیشاور میوزیم نادر و نایاب مجسموں سے بھرا ہوا ہے۔(تمک مکا کے ذریعہ یہ نادر مجسمے بیرون پاکستان اسمگل کیے جاتے تھے۔بیرونی ممالک کے قدر دان بھاری معاوضہ دے کر خرید لیتے تھے)۔

تخت بائی سے منگورہ(سوات) کی طرف جائیں سڑک کے کنارے کنارے اسٹوپاز، چٹانوں پر بدھ مت کی نامانوس زبانوں میں کندہ تحریریں(ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی ان تحریروں کو پڑھ کر سناتے تھے)اور چٹانوں پر بنائے ہوئے بدھ کے مجسمے ملیں گے۔جہاں جہاں بدھ تہذیب کے اثرات تھے، امن سانس لیتا محسوس ہوتا تھا۔پھر مذہب و عقیدہ کا آتش فشاں پھٹا۔ایسی امن دشمن ہوا چلی کہ مارچ ۲۰۰۱ء میں وسط افغانستان میں کابل سے تقریباً ۲۳۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر بامیان وادی میں 'بت ہائے بامیان' یعنی بامیان میں بدھ کے مجسمے انسانی تعصب کی نذر ہوگئے۔بامیان قدیمی شاہراہ ریشم پر واقع ہے۔یہ مجسمے گندھارا تہذیب کا ورثہ تھے۔ان مجسموں کا طول ۳۵تا ۵۳ میٹر تھا۔یہ مجسمے تقریباً آٹھ ہزار دو سو فٹ بلندی پر چٹانوں پر تراشے گئے تھے۔یہ مجسمے کھڑے ہوئے بدھ کے تھے۔دور حاضر کے مجسمہ ساز انگشت بدنداں کہتے ہیں کہ انہیں ایک ایسے دور میں بنایا گیا تھا جب اتنی اونچائی پر ایسا کام کرنے کی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔تاریخ کہتی ہے کہ چنگیز خان کے لشکروں نے اس علاقہ کو خوب روندا لیکن ان مجسموں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔چنگیز خان جانتا تھا کہ حکمرانی اور مذہب دشمنی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں افغانستان، وسط ایشیائی ممالک (بشمول چھوٹے سے ترمذ)اور موجودہ پاک و ہند پر سفید ہنوں اور ساسانیوں کی حکومت تھی۔یہ بنجارے یا خانہ بدوش تھے۔ان کے ہم خیال گروپوں نے ایک اتحاد بنایا اور وسط ایشیا کی طاقت بن گئے۔اتحاد میں ہی برکت ہے۔ساتویں صدی عیسوی میں ترمذ کے مقامی Goturks نے حکومت قائم کرلی۔یہ بھی خانہ بدوش قبائل تھے۔اناطولیہ کے ترک اسی نسل سے تھے۔ترک کے لغوی معنی ہیں 'مضبوط'۔ترمذ کے مقامی باشندے اناطولیہ کے ترکوں کی طرح توانا اور چست وچالاک تھے۔

عرب ۷۰۵ عیسوی میں ترمذ میں داخل ہوئے۔یہ ابادیس(Abbadis)اور سامانیوں کا عہد تھا۔سامانی خاندان کی ابتداء ایک فارسی دہقان 'سامان خدا' سے ہوئی۔ دہقان قبیلہ بڑا زمیندار تھا اور ساسانیوں کے رشتہ دار تھے۔یہی وہ دور ہے جب فارس کا کلچر ایران سے باہر نکلا اور خصوصاً اسلامی خطوں میں پہنچا۔سامانی فنون لطیفہ، فن تعمیر، ادب و سائنس کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔اس کے ساتھ ہی اپنی ثقافت برآمد کر رہے تھے۔(اکیسویں صدی میں یہ کام بالی وُڈ اپنی فلموں کے ذریعہ کر رہا ہے)۔بخارا اور بغداد ایک دوسرے کے رقیب تھے۔اس دور میں فارسی زبان نے فروغ پایا اور عربی کی رینکنگ نیچے آگئی۔سامانیوں نے رودکی (بوئے جوئے مولیاں آید ہمی۔یاد یار مہرباں آید ہمی)، دقیقی اور فردوسی جیسے شاعروں اور ابو سینا جیسے سائنس دان اور اسکالر کی سرپرستی کی۔یہ سامانی ہی تھے جنہوں نے کہا تھا کہ خطہ کی سرکاری زبان فارسی ہے اور ہمارے بادشاہ فارس کے ہیں۔ان کے بعد کرخند یس آگیے۔آتے ہی شاہی فرمان جاری کیا۔اس کے مطابق عربی ایک بار پھر سرکاری زبان قرار دی گئی۔دسویں صدی کے نصف آخر میں سامانی بھی اپنا بوریا بستر گول کرنے لگے۔الپتگین نے غزنی پر قبضہ کرلیا اور اپنی حکومت قائم کرلی۔پھر سبکتگین نے ہاتھ پاؤں نکالے اور غزنوی حکومت کی بنیاد رکھی۔محمود غزنوی نے سومنات کا مال لوٹا اور بت شکن مشہور ہوا۔

غرضیکہ سامانیوں کے دور میں دوسرے شہروں کی طرح ترمذ نے بھی ترقی کی۔قریب ہی بخارا میں بہت معروف اسکالر، ادیب، شاعر اور آرٹسٹ جمع ہوگئے تھے۔ان کی اکثریت کا تعلق مسلمان ملکوں سے تھا۔وہ ترمذ کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لئے معاون بنے۔بخارا میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی قائم ہوگئی۔

جب سامانیوں کا دور ختم ہوا اور بخارا و ترمذ کے جوہر منتشر ہونے لگے تو فردوسی نے آہ بھری اور ایک شعر میں سوال کیا: کجا آں بزرگان ساسانیاں۔زبہرامیاں تابہ سامانیاں(بہرامیوں سے سامانیوں تک ہماری ساسانی شخصیات کہاں چلی گئیں؟)

نویں صدی سے بارہویں صدی(بارہویں صدی کمال الدین ترمذیؒ کی ہندوستان کی طرف ہجرت کی صدی ہے)تک ترمذ ایک بڑا شہر بن چکا تھا۔شہر کی فصیل دس میل طویل تھی۔شہر کے نو دروازے تھے۔ثقافت اور تجارت اس کی شناخت تھی۔اس دور میں غزنویوں، سلجوقیوں اور کاراخاندیسیوں نے ترمذ پر حکومت کی۔۱۲۰۶ عیسوی میں ترمذ خوارزم شاہی حکومت کا حصہ بن گیا۔

۱۲۰۶عیسوی میں تموچن (چنگیز خان) نے اپنے تاتاری خانہ بدوش قبائل جمع کیے اور تاتاری سلطنت بنالی۔ اس دوران جب ترمذ کے شہری کمزور پڑے تو تاتاریوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

جنوری ۱۸۹۳ء میں بخارا کی امارت نے پتا کیسر (ترمذ میں شامل تھا) کا قصبہ روس کے حوالے کر دیا۔ روسی حکومت نے وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ فوجی اڈّا بنایا۔ دریائے آمو (ماور اُلنہر) پر بندر گاہ بنائی۔ ۱۹۲۸ء تک پتا کیسر سویت یونین کا حصہ بن چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں ستم ہائے روزگار کے نتیجہ میں ترمذ نام کی کوئی آبادی نہیں تھی۔ بعد میں سویت یونین کا حصہ بننے کے بعد ترمذ کو اپنی پرانی شناخت اور نام واپس مل گئے۔ ۱۹۲۹ء میں ترمذ ایک بڑا شہر بن چکا تھا۔ سویت یونین کی حکومتی سرپرستی میں ترمذ صنعتی شہر بنا۔ ایک تھیٹر قائم ہوا اور درس وتدریس کا ایک ادارہ بھی قائم ہوا۔ اس ادارہ کا قیام ترمذ کی صدیوں پرانی علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کا اعتراف تھا۔

۱۹۷۹۔۱۹۸۹ء کے دس سال ترمذ کی تاریخ میں بہت اہم تھے۔ یہ افغان جنگ کا دور تھا۔ مغربی ملکوں نے افغانستان سے روسی فوجوں کو نکالنے کے لئے پاکستان کو آگے کر دیا تھا۔ پاکستان ڈالرز اور جدید ہتھیاروں کے عوض اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر مجاہدین کے ذریعہ لڑ رہا تھا۔ دوسری طرف سویت یونین نے ترمذ کو بطور ایک فوجی اڈّا develop کرنا شروع کیا۔ فرینڈشپ برج یا دوستی پل بنایا تاکہ دریائے آمو (ماور اُلنہر) کے آر پار آمدورفت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

تعمیر و ترقی کا سفر طے کرتے ہوئے جب ترمذ ۲۰۰۹ء میں پہنچا تو ایک علاقائی ریلوے جنکشن بنا۔ مقصد یہ تھا کہ نیٹو ملکوں کا سامان رسد صحیح سلامت فوجی ٹھکانوں تک پہنچ جائے۔ اس سامان رسد میں اسلحہ بھی تھا اور اس کے طریقہ استعمال کے کتابچے بھی تھے۔ یہ لو اسلحہ۔ روسیوں کو مارو اور جو تمہیں روکے اسے بھی مارو۔ بدقسمتی سے ہم امن کی باتیں کرتے ہیں اور جنگ کے منصوبے بناتے ہیں۔

اس طرح روس، قازقستان اور ازبکستان کا ریل روٹ بنایا گیا۔ ترکمانستان ایک طرف رہ گیا۔ ۲۰۱۵ء میں حکومت پاکستان نے گوادر تا ترمذ ایک ہائی وے بنانے کا اعلان کیا۔ اس خطہ میں امن رہا تو ہائی وے بنانے کے مقاصد پورے ہوں گے۔ جب یہ سڑک بن جائے گی تو ہماری نوجوان سادات نسل کو ترمذ میں اپنی رُوٹس کے بارے میں مزید جاننے اور عہد قدیم کے تاریخی آثار کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ گیارہویں اور بارہویں کے ترمذی حکمرانوں (امیروں) کے محل اور سلطان سعادت کا مقبرہ قابل دید ہیں۔ روایت ہے کہ اس مقبرہ میں دفن سید خاندانوں کے ترمذیوں کا نسب حضرت محمد رسول تک پہنچتا ہے۔ وسط ایشیائی ملکوں کی تہذیبی اور تمدّنی زندگی میں شاہراہ ریشم کا کلیدی کردار ہے۔ راوی کہتا ہے کہ شاہراہ ریشم حادثاتی طور پر دریافت ہوئی تھی۔

دوسری صدی قبل مسیح تک یورپ سے ایشیاء میں داخل ہونے والے سارے راستے چین کی سرحد پر ختم ہو جاتے تھے۔ قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ تہذیبوں اور مال تجارت کے قافلوں کے داخلہ کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ یہ راستہ چین کے ایک سفارت کار ژانگ جیاں نے کئی دیگر ملکوں کے سفارت کاروں سے مل کر دریافت کیا تھا۔ جس کو معلوم ہوا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے موجود نئی دنیا دیکھنے کے لئے سامان سفر باندھا۔ سیاح مارکو پولو صاحب نے بھی اسی راستے چین کا سفر اختیار کیا اور جناب قبلائی خان اور اس کے درباریوں کو حیران کر دیا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" قبلائی خان کا مارکو پولو سے پہلا سوال تھا۔

۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی عیسوی میں ہزاروں سڑکیں (اور انٹر چینج) چھوٹے بڑے تجارتی قافلوں کا بوجھ اٹھائے شاہراہ ریشم پر آتیں اور وسط ایشیائی شہروں کے قلب سے گزر کر مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتی تھیں۔ اس شاہراہ ریشم کے ذریعہ مال تجارت، کلچر اور مذہب کا تبادلہ ہوتا تھا۔ قیمتی کپڑا، علاقعہ کی مشہور اشیاء، مسالہ جات، سونا چاندی، جواہرات اور پرندوں کی بہت مانگ تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کاروان سرائے تھیں۔ قافلہ کی سواریاں تھک جاتیں تو ان میں تکان اتار تیں۔ اپنی تکان اتار کر اگلی منزل کی طرف روانہ ہوتیں۔ ہزاروں کلو میٹر زلمبی اس شاہراہ ریشم نے اپنے تجارتی قافلوں، روحانی مسرّتوں اور ثقافتی رنگا رنگی کے ذریعہ ساری دنیا کی توجّہ اپنی طرف مبذول کی ہوئی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یوں لگتا تھا کہ دنیا کی ساری رونق شاہراہ ریشم پر سمٹ آئی ہے۔ جہاں سے گزر و دستکاری کے مرکز موجود، خطاطی، مصوری، کندہ کاری اور فنون لطیفہ کے اسکول اور درسگاہیں موجود ہیں۔ دلکش عمارتیں۔ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی کیفیت پیدا کرتیں۔ مال تجارت سے لدے پھندے یہ قافلے شاہراہ ریشم کے ذریعہ تاشقند (زمانہ قدیم میں اس کا نام شاش تھا)، سمرقند، بخارا اور خیوا (ازبکستان) سے گزر کر شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے وطن فرغانہ

سے گزر کر کاشغر (سنکیانگ) میں داخل ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ چین، کرغزستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، باختریہ (شمالی افغانستان)، ایران، آذربائجان اور جارجیا اسی شاہراہ ریشم پر واقع تھے۔

شہر خیوا کا قصہ سنیے۔ ان دنوں یہ ازبکستان کا صدر مقام ہے۔ راوی کہتا ہے کہ یہ شہر نوحؑ کے ایک بیٹے شیم (Shem) نے دریافت کیا تھا۔ روایت ہے کہ شیم صاحب چہل قدمی فرما رہے تھے۔ ٹھوکر لگی اور زمین پر گرے۔ یہ ایک کنواں تھا۔ پانی پی کر دیکھا تو میٹھا تھا۔ بیساختہ کہا "خی۔ وا" یعنی میٹھا۔ واللہ اعلم۔ لیکن ترمذ تو ترمذ ہے۔ ہمارے اجداد کا وطن۔ خاک ترمذ سے کئی نابغہ روزگار سر بلند ہوئے۔ چند کا ذکر کرتے ہیں:

- حکیم الترمذی:- ابو عبداللہ محمد ابن علی الحکیم الترمذی الحنفی۔ نویں صدی کے صوفی۔ اپنے وقت کے بڑے اسکالرز میں شمار ہوتا ہے۔ سنّی فقیہ اور محدث ہیں۔ صوفی ازم کی طرف اچانک راغب ہوئے تھے۔ صوفی ازم کے موضوع پر اوّلیں مصنّفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے والد علی بن علی حسن، چچا اور والدہ بھی محدث تھے۔ 'مقامات الباطن' حکیم الترمذی کی اہم ترین تصنیف ہے۔ اس کا موضوع 'قلب' ہے۔ حکیم الترمذی نے قلب کی باطنی درجہ بندی کی ہے۔ موصوف ابن عربی کے پیشرو ہیں۔
- میر سعید برؔکہ: فلسفی اور امیر تیمور کے استاد (اتالیق) ہیں۔
- ابوالقاسم فردوسی طوسی:- (۹۴۰-۱۰۲۰ عیسوی) مصنّف شاہنامہ۔ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کیونکہ اس پیش لفظ کا موضوع شجرہ یا نسب نامہ ہے تو اس حوالہ سے ان کا شعر یاد آرہا ہے۔ یہ شعر گزشتہ صفحہ پر بھی درج کر چکا ہوں۔ فردوسی نے اپنے اس شعر میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ "بہرامیوں سے سامانیوں تک ہماری ساسانی شخصیات کہاں چلی گئیں؟" اس سوال میں فردوسی کے کرب اور مایوسی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان قیمتی شخصیات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ (ہمارے زمانہ کے missing persons)۔ کسی نے ان کے بارے میں تحقیق و جستجو کی کوشش نہیں کی ہے۔
- امام ابو عیسیٰ الترمذی:- اسلامی اسکالر۔ ولادت بُغ (نزد ترمذ ازبکستان) مدفن شیر آباد۔ ترمذ کے شمال میں ۶۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر۔ امام ابو عیسیٰ الترمذی نے احادیث جمع کرنے اور پرکھنے کے سارے مروّجہ اصول پیش نظر رکھ کر احادیث نبویؐ جمع کی ہیں۔ 'شمائل محمدیہؐ' کے مصنّف ہیں۔

لیکن اب ہماری نسبی مسافتیں پوری طرح محفوظ اور بہت حد تک ریکارڈ پر ہیں۔ جناب عابد حسین، جناب غنی حیدر زیدی، جناب عبدالرشید زیدی ندوی، کموڈور (ر) سید محمد خورشید عالم زیدی، جناب عمران متانت حسین (روفی) اور محترمہ ڈاکٹر سہیلہ مشرف کو اس کا کریڈٹ جاتا ہے۔ ان سے پہلے یا ان کا ہم عصر اگر کوئی نسّاب موجود ہے تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ ہماری مذکورہ شخصیات میں سے کسی نے بھی علم الآنساب (genealogy) کا مضمون کسی مکتب یا یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔ ان سب کا علم اکتسابی ہے۔ اس لئے ان کی جتنی تحسین کی جائے وہ کم ہے۔ اگر ہمارے یہ ممدوح نہ ہوتے تو ہم بھی فردوسی کا شعر پڑھتے اور آہیں بھرتے۔

کجا آں بزرگان ساسانیاں۔ ز بہرامیاں تابہ سامانیاں

ہم اس میں تصرف کرتے۔ فردوسی صاحب سے معذرت کے ساتھ۔

کجا آں بزرگان بجنوریاں۔ ز سیوہاریاں تابہ نہٹوریاں

ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ماضی میں ہمارے آباء واجداد کا تعلق کہاں سے رہا ہے؟ یہ سیادہ اور معصوم سوالات انسان خود سے پوچھتے رہتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے علم الانساب وجود میں آیا۔ شجرہ نویسی، خود کو دریافت کرنے اور اپنا نسبی تشخّص قائم رکھنے کی آخری کوشش ہے۔ اب DNA بھی مستعمل ہے۔ اس علم کے ذریعہ گم شدہ زمانوں کے گم شدہ نام ونسب بازیافت کیے جاتے ہیں۔ شجرہ نسب خاندانی تسلسل کی نسبی تاریخ بھی ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں یہ تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تاریخ نہیں ہے۔ تاریخی اشارے ہیں جو اس امید پر لکھے ہیں کہ کوئی جوان 'قبیلہ کی آنکھ کا تارا' اپنے سادات قبیلہ کی تاریخ مکمل کرے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران یورپ میں خاندان کے خاندان جنگ کا ایندھن بن کر صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئے تھے۔ پسماندگان اپنے پیاروں کی تلاش میں سر گرداں تھے۔ یورپی عدالتوں میں عدم ثبوت کی بنا پر زمینوں کے زیر سماعت تنازعے بھی pending تھے (لاہور ہائی کورٹ میں رحیم یار خان کی زرعی زمین کا تنازعہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ سے pending ہے)۔ Genealogy سافٹوئر کی ایجاد سے یوپ کے جنگ متاثرین کے وراثتی مسائل حل ہوئے۔ کچھ کے

رشتے دوبارہ بحال ہوئے اور کچھ کو وراثت میں حق ملا۔ علم الانساب میں یہ بہت بڑی سائینسی انقلابی پیش رفت تھی۔ اسی دوران ہم مائی فیملی ڈاٹ کام سے متعارف ہوئے۔

مائی فیملی ڈاٹ کام سید محمد خورشید عالم زیدی نے بنائی تھی۔ اس کے ذریعہ ہم لوگ بینَ البرّ اعظم کی سطح پر پورے خاندان کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ کیا کر رہے ہو؟ بیٹے کا کیا نام رکھا ہے؟ وغیرہ۔ سالگرہ اور شادی کی تقاریب کی تصاویر بھی پوسٹ کی جاتی تھیں۔ جب ٹی وی پاکستان میں نیا نیا آیا تھا تو ہماری امی سب کو آوازیں دیتیں۔ "آؤ ٹی وی کا وقت ہو گیا ہے۔" مائی فیملی ڈاٹ کام نے بھی سب کو جمع کر لیا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے۔ کبھی مقامی ٹیکنکل وجوہ کے نتیجہ میں ویب سائٹ نہ کھلتی تو محسوس ہوتا کہ زندگی میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا کہ کچھ مبہم تنازعے شروع ہو گئے۔ بہت بدمزگی ہوئی۔ سید محمد خورشید عالم زیدی نے معاملات سدھارنے کی سعئی لاحاصل کی۔ انجام کار 'مرقع سادات نہٹور' ویب سائٹ بند ہو گئی۔ اناللہ۔۔۔ الخ ہماری عدم دلچسپی کے سبب ہی ماضی میں میگزین مرقع سادات نہٹور بند ہوُا تھا۔ دوبارہ اناللہ۔۔۔ الخ۔

اسی دوران اپنے زمانہ طالب علمی میں عاصم میثاق زیدی نے مائی زیدی ڈاٹ کام لانچ کی۔ یہ شاید یونیورسٹی آف سدرن کولوریڈو میں ان کے انجینئرنگ اسکول کا کا کوئی پروجیکٹ تھا۔ کچھ دنوں تک اس ویب سائٹ پر بھی خوب رونق رہی۔ پھر اکثریت نے کہا 'مرقع سادات نہٹور' کی ویب سائٹ کے ہوتے ہوئے مائی زیدی ڈاٹ کام کی ضورت نہیں ہے۔ اس طرح رشتے تقسیم ہو رہے ہیں۔ عاصم " حاضر جناب "قسم کے نوجوان ہیں۔ انہوں نے "ٹھیک ہے" کہا اور مائی زیدی ڈاٹ کام بند ہو گئی۔

ان دنوں مرقع سادات نہٹور کی ویب سائٹ پر میں نے تجویز دی کہ خاندان میں فلاحی کام ہونے چاہئیں۔ رشتے کرائے جائیں۔ ملک کے اندر اور باہر تعلیمی وظائف دیے جائیں۔ کسی کو (خدانخواستہ) مالی آزمائش کا سامنا ہو تو مالی مدد کی جائے۔ سادات کی شناخت ہی یہ کام ہیں۔ ہم نے حضرت علیؑ اور بی بی فاطمہؑ کے قصے پڑھے ہیں۔ بجنور کی آل سید السادات بڑے عہدوں پر فائز رہی۔ بہت نام کمایا۔ پیسے کی ریل پیل کے باوصف ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے خلق خدا آسودہ ہو۔ میری تجویز کو سب نے بالاتفاق پسند کیا اور مشورے بھی دیے۔

ایک روز میں (یعنی یہ نیاز مند)، غیوّر بھائی، محمّد اکرم (قمر زیدی)، رفیع الدین حیدر، شاہد غیور میری دعوت پر عم زاد لقاءاحمد کے گھر (ناظم آباد کراچی) میں جمع ہوئے اور سادات نہٹور ویلفیئر سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ میں نے چند ہفتوں میں آئین تیار کر لیا۔ اب کے غیور بھاسی کے گھر (B ۸۶، بلاک ۱۳ فیڈرل بی ایریا کراچی) اجلاس طلب کیا۔ حاضرین کی تعداد بھی بہت تھی۔ اس اجلاس میں دیگر کے علاوہ کرنل (ر) حاتم زیدی اور سید محمد خورشید عالم زیدی بھی شریک تھے۔ میرا مجوّزہ آئین تمام حاضرین نے پسند کیا اور منظور کر لیا۔ میں نے کئی مشکل مرحلے بھی اکیلے ہی طے کیے۔ کچھ عزیزوں نے ویب سائٹ پر گراں قدر عطیات کے اعلان بھی کیے۔ لیکن یہ سوسائیٹی کوئی قابل ذکر کام کیے بغیر مرحوم ہو گئی۔ غیور بھائی سرپرست، میں صدر اور لقاءاحمد زیدی جنرل سیکریٹری اور کرنل (ر) حاتم زیدی نائب صدر منتخب کیے گئے تھے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نسل کے لوگوں نے اپنی بساط کے مطابق سادات کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ شجرہ نویسی کی، میگزین جاری کیا، باہمی رابطے بحال رکھنے کے لئے دو ویب سائٹس بنائیں، ویلفیئر سوسائٹی کے ذریعہ فلاحی کام کرنے کی نیت کی، فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے عطیات دینے کا اعلان کیا لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوُا۔ ایسا کیوں نہ ہو سکا؟ مجھے اس کا جواب معلوم نہیں ہے۔ خیر! یہ تو ماضی کے قصے ہیں۔ انسانوں کے ماضی کے ساتھ ایک حال اور مستقبل بھی ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بٹوارہ نے برصغیر میں بڑی ہلچل مچائی۔ لیڈروں نے انتقال آبادی کے لئے کوئی موثر منصوبہ نہیں بنایا تھا (اوّل تو انتقال آبادی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سعودی عرب ایک اسلامی ملک ہے۔ کیا سعودی عرب پہ ہمارا کوئی استحقاق ہے)۔ نتیجہ بڑے پیمانہ پر (تاتاری ہلاکتوں سے زیادہ) قتل و غارت گری ہوئی۔ جو زندہ بچے وہ بھی ایک دوسرے کے لئے مر گئے۔ آدھے بچے سرحد کے اس طرف، آدھے بچے سرحد کی دوسری طرف۔ ماں ادھر، باپ ادھر۔ میاں ایک ملک میں بیوی دوسرے ملک میں۔ دونوں ملکوں کی اشرافیہ اور حکمران جنتا نے ایک دوسرے کو دشمن قرار دے دیا۔ جنگیں لڑنی شروع کیں۔ وجہ یہ تھی کہ اگر امن قائم ہوُا تو تصدیق کا عمل شروع ہو گا اور ناجائز قبضے چھڑائے جائیں گے۔ سرحد کے دونوں طرف ہجرت کرنے والے خاندان کمزور ہو گئے تھے (اب تک اسی حال میں ہیں۔) آپ نے آبائی گھر اور آبائی قبرستان کا ذکر سنا ہو گا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جن لوگوں نے ادھر یا ادھر سرحد پار کی وہ اپنے آبائی گھر اور آبائی قبرستان سرحد کے پار چھوڑ آئے۔ لیکن بڑا المیہ یہ ہوُا کہ شرنارتھی اور مہاجر اقلیت بن کر معاون اداکار بنے ہوئے ہیں۔ محنت مزدوری کر کے اکثر نے گھر بنا لیے ہیں۔ لیکن قبیلہ تقسیم ہوُا تو طاقت بھی تقسیم ہوئی۔ اس کے بعد

مزید تقسیم کا آغاز ہوا۔ تعلیم اور روزگار کے مسائل پیدا ہوئے۔ نوجوانوں نے افق کے پار دیکھنا شروع کیا۔ گھر کے گھر خالی ہوگئے۔ ان کے نئے مسکن مشرق بعید، مڈل ایسٹ، ترکی، آسٹریلیا، یورپ اور امریکہ بنے۔

قوم اور مذہب سے باہر رشتے ہونے لگے۔ کسی نے لب کشائی نہیں کی۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا تھا۔ صدیوں کے عمل کے بعد رسم و رواج، روایات اور رشتے قائم ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دل دھڑکنے لگتے تھے۔ بازو کھل جاتے تھے۔ چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ اب ویزا اور مہنگا فضائی ٹکٹ میل ملاپ میں رکاوٹ بن گئے۔ گھر چھوڑ کر جانے والے اپنے آباء و اجداد کے معاشرہ سے کٹ کر رہ گئے۔ ان جانے والوں کے بچّوں میں سے کتنے بچّے اپنے دادا اور نانا کے نام بتا سکتے ہیں۔ میں نے ایک امریکی دادا سے پوچھا، تمہاری پانچ سال کی پوتی تمہارا نام لیتی ہے، کیوں؟ گورے امریکی دادا نے ایک لمحے کے لئے توقّف کیا، پوتی کو پیار سے دیکھا اور کہا "نام نہیں لے گی تو میرا نام بھول جائے گی۔ امریکہ میں دادا کے علاوہ دلچسپی کے سامان بہت ہیں۔"

قباحت یہ ہے کہ فرد معاشرہ میں صرف اس وقت تک عزت سے گزر بسر کر سکتا ہے جب اس کا قبیلہ یا خاندان ہو۔ فاٹا ایجنسیوں کے قبائل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب فرد کو سزا دینی منظور ہو تو اسے قبیلہ بدر کیا جاتا ہے۔ اس سے ہلکی سزا یہ ہے کہ اس کے گھر کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ یہ مثال دینے سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں قبائلی معاشرہ کو آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ اس کے برعکس میں میانہ روی کو بہتر سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم اپنے معاشرہ کی شکست و ریخت کو نہیں روک سکتے۔ لیکن ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ خاندان کے عالم و فاضل نوجوان اس طرح 'سماجی تنہائی' اختیار نہ کریں۔ خاندان ٹوٹنے نہ پائے۔ پس شجرہ نویسی، میگزین کی رضاکارانہ اشاعت، ویب سائٹس کا اجراء اور فلاحی سوسائیٹی کا قیام اپنی شناخت برقرار رکھنے کی مخلصانہ کوششیں ہیں جو جاری رہنی چاہیئے۔ ہماری نسل نے یہ کام کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اب ہماری نوجوان نسل کو بھی کچھ کر کے دکھانا چاہیئے۔ سید کمال الدین ترمذیؒ پورے خاندان کے ساتھ ہندوستان آئے۔ بابا پیچھے رہ گئے تھے۔ دس سال بعد ان سے ملنے ترمذ گئے تھے۔

مؤرّخین کے مطابق جب دہلی کے پہلے ترک سلطان قطب الدین ایبک (۱۱۵۰۔۱۲۱۰ء) نے راجستھان میں رنتھمبور کو فتح کیا تو وہاں سے فرار ہونے والوں نے دوسرے مقامات کے علاوہ نہٹور میں بھی پناہ لی۔ اس وقت تک اس جگہ کا کوئی نام نہیں تھا۔ جب بستی کے نشان ظاہر ہونے لگے تو اس کے بانیوں نے اسے "نیو ٹور" کہنا شروع کیا۔ نیو ٹور کے معنی ہیں نئی قیام گاہ۔ بعد میں جب حکومت برطانیہ نے اپنی ریلوے پٹریاں بچھائیں تو ریلوے اسٹیشن دھام پور بنا۔ ۱۹۴۷ تک نہٹور ایک پسماندہ قصبہ تھا۔

برطانوی راج میں نہٹور تیاگیوں (تیاگی یا تاگی اجمیر سے آئے تھے)، ہندو مسلمان چودھریوں اور سید کمال الدین ترمذیؒ کی چھٹی نسل کے سیدوں کا مسکن تھا۔ یہاں پاٹھ شالاؤں میں سنسکرت اور مدرسوں میں فارسی اور عربی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ مذہبی منافرت نام کو نہیں تھی۔ ان روہیلکھنڈی بستیوں کا ہمیشہ یہی تشخّص رہا ہے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے تہواروں اور تقاریب میں شریک رہتے تھے۔ (میں نے سنا ہے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے)۔ عجیب و غریب لوگ ہیں۔ کسی کو کسی سے پہلے کوئی شکایت تھی نہ اب ہے۔ پرانے زمانہ میں وسائل پر سیّدوں اور تیاگیوں کا قبضہ تھا۔ بارہ ٹوپی سرکار قائم تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں (غدر یا جنگ آزادی) برطانوی سرکار نہٹور سے اتنی خوش ہوئی کہ وہاں بارہ ٹوپی سرکار قائم کر دی۔ یہ سرکار اپنے فیصلوں میں آزاد تھی۔ انگریزی فوج روہیلوں سے خوف زدہ تھی۔

شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں جناب سید حسن ولد سیّد ضیاء الدین اپنا چار ہزاری منصب چھوڑ کر نہٹور آ گئے۔ اُن سے سادات کا سلسلہ نسب شروع ہوا۔ اسی سلسلۂ نسب میں جناب بندۂ علیٰ ہیں۔ اُن کے نام کے ضمن میں سننے میں آیا ہے کہ اُن کا نام بندۂ علی تھا۔ عوام الناس نے اُسے بندے علی بنا دیا۔ یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

کم و بیش اسی زمانہ میں 'واسطی' سیدوں کا خانوادہ نگینہ میں اپنے قدم جما رہا تھا۔ اس خانوادے کے مورثِ اعلیٰ بھی زید شہیدؒ بن امام زین العابدینؑ ہیں۔ لیکن واسطی عراق کے شہر واسط سے آئے تھے۔ واسطی خانوادہ کے کچھ لوگ کیتھل میں سید کمال الدین ترمذیؒ کے پاس آ گئے تھے۔ لہٰذا جب کیتھل کے ترمذی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گئے تو واسطی بھی ضلع بجنور (اور مراد آباد) کے مختلف شہر و دیہات میں گئے۔ ان کا بڑا مرکز مظفر نگر کے بعد نگینہ تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر (جنگ آزادی) میں برطانوی فوج اور نجیب آباد کے روہیلہ نواب کے درمیان جنگ ہوئی۔ نجیب آباد، نگینہ کے ہمسائے میں ہے۔ اس جنگ میں نجیب آباد کے نواب کو شکست ہوئی۔ انگریز کو نگینہ کے سیدوں کی وفاداری پر شک تھا۔ قیاس ہے کہ فاصلہ کی قربت کی وجہ سے نگینوی عوام نے نجیب آباد کے نواب کی حمایت کی ہوگی۔ انگریز دور اندیش قوم ہے۔ انہوں نے نجیب آباد اور نگینہ کو ترقی دینی شروع کی۔ جب جنگ افغانستان شروع ہوئی تو اسلام آباد میں ایک سیمینار ہوُا۔ ایک یورپی اسکالر نے مثالیں دے کر کہا کہ اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے نوآبادیات کو ترقی دی گئی تھی۔ اس لئے اسلحے پر رقم خرچ کرنے کی بجائے افغانستان اور اس کے ہمسائے میں فاٹا کو ترقی دی جائے۔ کسی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ ہم سے یہ بھول چوک پہلے مشرقی پاکستان میں ہوئی اور اب بلوچستان میں ہو رہی ہے۔ لہٰذا دونوں شہروں یعنی نگینہ اور نجیب آباد کے ریلوے اسٹیشن بنائے گئے تاکہ فوج تیزی سے نقل و حرکت کر سکے۔ نجیب آباد سے آگے ہندوؤں کا مقدس شہر ہردوُار ہے۔ یہ ہمالیہ کی جڑوں میں گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اس شہر میں سال کے بارہ مہینے یاتریوں کا مہینہ لگا رہتا ہے۔ ہردوُار سے چند گھنٹوں کی مسافت پر رڑکی ہے۔ یہ چھاؤنی ہے اور گنگا کینال پر گنیش پل پار کر کے دہرہ دون کے جنگلات شروع ہوتے ہیں۔ پہلے یہ اترپردیش یعنی یوپی تھا۔ اب اتّر کھنڈ ہے۔ بھارت کی ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق نگینہ میں مسلمان کل آبادی کا ۷۰.۵۳% تھے۔ نگینہ اب بھی سیدوں کا شہر ہے۔ واسطی اور زیدی۔ ایک جملہ معترضہ۔ برطانوی فارمولے کے مطابق حکومت پاکستان نے نگینہ اور نجیب آباد کی ترقی کا ماڈل سامنے رکھ کر بلوچستان کو کیوں ترقی نہیں دی؟ اس ترقی کی وجہ سے ان علاقوں سے روہیلہ اثرات ختم ہو گئے تھے۔ روہیلہ باغیوں نے ہندوستان میں زلزلہ بپا کر دیا تھا۔ پاکستانی بلوچ عوام (سرداروں کے بارے میں میرے تحفظات ہیں) معصوم اور سادہ ہیں۔

سید محمد خورشید عالم زیدی کے تعاون (فراہم کردہ فیڈبیک) سے عمران متانت حسین (روفی) نے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ جو شجرہ تصنیف/مرتّب کیا ہے اس میں (۱) پہلی بار خواتین کے نام شجرہ میں شامل ہیں (۲) پہلی بار دیگر قصبات و دیہات کے ان سیدوں کے نام شجرہ میں شامل ہیں جن کی زوجیت نہٹور سے ہے۔ خانوادہ السید السارات کو یکجا کرنے کی یہ اہم ترین کوشش ہے۔ اگر یہ یکجائی ہو جائے تو قابل فخر بات ہوگی۔ اس کے نتائج بھی مثبت اور خوشگوار ہوں گے۔

سادات سیوہارہ، نہٹور، نگینہ، نجیب آباد، دھام پور، نیندڑو، چاند پور اور شیر کوٹ کے شہروں اور قصبوں کو مردم خیز خطہ کہا جاتا ہے۔ ضلع بجنور کی سرزمین (مراد آباد اور نجیب آباد کو شامل سمجھا جائے) نے قابل فخر شخصیات پیدا کیں۔ یہ بجنور اور نجیب آباد کے روہیلکھنڈی ہی تھے جو بٹوارہ سے قبل کے شمالی ہندوستان کا کلچر، تاریخ و سیاست تھے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ سید احمد خان کی رائے پر اکتفا کروں گا۔

سید احمد خان علی گڑھ میں اپنے تعلیمی مشن کی سرگرمیوں کے لئے عطیّات لینے نکلے تو نہٹور بھی گئے۔ اہل نہٹور نے انہیں مالامال کر دیا۔ سید احمد خان نے آل سید السادات کی سخاوت سے خوش ہو کر انہیں 'دانشمندان نہٹور' کہا تھا۔ وقت نے ثابت کیا کہ انہوں نے درست ہی کہا تھا۔ گنج بخش (سید اشرف) اور گھوڑا بخش (سید علی) کی فیّاضی کی دھوم ابھی تک موجود ہے۔

ایک نظر شخصیات پر جن کی تعداد بہت ہے۔ میرے علم میں یہی ہیں:

- بخت خان روہیلہ: نواب نجیب الدولہ کا پوتا۔ مغل ہندوستان میں حرّیت پسندوں کی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ بجنور (روہیل کھنڈ) میں پیدا ہوُا تھا۔ بخت خان نے بادشاہ کو آخری وقت (آخری سپاہی) تک لڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ زخمی ہو کر بُنیر چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوُا۔ بخت خان روہیلہ کا پیر بابا، سیدہ ام مریم سے کیا رشتہ تھا؟ ہمیں تاریخ میں اس کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔
- مولانا شبّیر احمد عثمانی: بجنور۔ اسکالر۔ تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن۔
- ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری: اسکالر۔ محاسنِ غالب۔ انہوں نے کہا، ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں (۱) مقدس وید اور (۲) اور دیوان غالب۔ تعلق سیوہارہ سے ہے۔
- مولانا حفظ الرحمٰن۔ مرکزی سیکرٹری جنرل جمیعت العلمائے ہند۔ مصنف قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ تعلق سیوہارہ سے ہے۔
- حافظ محمد ابراہیم: نگینہ اور سیوہارہ۔ دس برس سے زیادہ عرصے تک نہرو کابینہ میں مرکزی وزیر خوراک و زراعت رہے۔
- چودھری چرن سنگھ: نور پور (ضلع بجنور)۔ بھارت کے چھٹے وزیر اعظم جنتا پارٹی۔

- پروفیسر خورشید الاسلام: سیوہارہ۔ مارکسسٹ اسکالر۔
- گیان چند جین: سیوہارہ۔ آخر عمر میں متنازعہ کتاب تصنیف کی۔ 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ۔'
- راشد علوی: چاند پور ضلع بجنور۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے رکن رہے۔
- آصف علی: سیوہارہ۔ امریکہ میں پہلے بھارتی سفیر۔ گورنر اڑیسہ ان کی ہندو اہلیہ کا نام ارونا آصف علی ہے۔ بنگال کی تھیں۔ عمر میں ۲۱ سال بڑی تھیں۔ زبردست قوم پرست تھیں۔ (میں آصف علی کی سیوہارہ کی سکونت کی تصدیق نہیں کر سکا)۔
- شجاعت علی صدیقی: سیوہارہ۔ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان۔
- بی بی اشرف (اشرف النساء) بھنیرا ضلع بجنور۔ ان کے بزرگ مغل ہندوستان میں بخارا سے آئے تھے۔ بخاری (شیعہ) سید تھیں۔ جاگیر دار خاندان میں شادی ہوئی تھی۔ شوہر وکیل تھے۔ بیوہ ہو گئیں تو لڑکیوں کو تعلیم دینے لگیں۔ اس زمانہ کی دقیانوسیت میں لڑکیاں اپنے مرد عزیز و اقارب سے بات نہیں کر سکتی تھیں۔ بی بی اشرف علی کی علمی خدمات کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔
- اختر الایمان: نجیب آباد۔ شاعر اور اسکرین کے مسوّدہ نگار۔ اختر الایمان نے قانون، دھرم پتّر، گمراہ، وقت، پتھر کے صنم، داغ، جورو کا غلام اور آج اور کل جیسی فلموں کے مسوّدے لکھے ہیں۔
- مولوی ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۳ـ۱۹۱۲ء): بجنور۔ ناول نگار۔ ان کی تصنیف مرأۃ العروس کا انگریزی ترجمہ لندن کے مصنّف G.E. Ward نے کیا۔
- اردو فکشن کی خاتون اوّل قرۃ العین حیدر: نہٹور۔
- سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر: نہٹور {نذر سجاد اپنے والدین کے ساتھ نوشہرہ، کوہاٹ اور مراد آباد (یوپی) میں بھی رہائش پذیر رہی ہیں۔} ایک مشہور قول ہے کہ اسکالر کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔
- احمد علی سیوہاروی: پیدائش سہ دری۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ بعد میں سزا معاف ہو گئی لیکن جائداد ضبط ہو گئی۔ انتقال جھانسی۔
- نہال سیوہاروی: بیسویں صدی کے مشہور شاعر۔
- ہلال سیوہاروی: انقلابی شاعر۔
- مولوی مرزا مجید حسن بجنوری۔ بانی مدینہ بجنور (اردو روزنامہ)۔ اس کے اداریوں سے اقتباس علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھے۔ اس جریدے کے پہلے ایڈیٹر حمید اللہ انصاری تھے۔ مولوی مرزا مجید حسن بجنوری ۱۹۶۶ء میں فوت ہوئے تھے۔
- جناب حکیم سید حسن رضاء۔ سیوہارہ۔ سماجی خدمات۔
- مولانا سید عبد الغفور۔ سیوہارہ۔ اسکالر اور مبلّغ۔
- ڈاکٹر سیّد تسلیم احمد زیدی۔ سیوہارہ۔ طویل عرصہ تک صدر آل انڈیا مسلم لیگ سیوہارہ۔ چیرمین، میونسپل کمیٹی سیوہارہ۔ سیوہارہ کی جامع مسجد، دہلی کی جامع مسجد کے نمونہ پر حکیم سید حسن رضاء اور ڈاکٹر سید تسلیم احمد کی شراکت سے اپنی ملکیت قطعۂ اراضی اور دونوں کے ذاتی فنڈز سے تعمیر ہوئی۔ اِس مسجد کا مرکزی دروازہ مین بازار میں ہے۔ عقبی دروازہ محلہ سادات کے مشترکہ وسیع میدان میں کھلتا ہے۔ اس صحن میں اندر کی طرف جناب حسن رضاء۔ جناب ظفر علی۔ جناب مظہر علی اور ڈاکٹر تسلیم احمد زیدی کے گھروں کے دروازے بھی کھلتے تھے۔ اس پردہ صحن میں بعد مغرب خواتین چہل قدمی اور تبادلۂ خیال کرتی تھیں۔ جامع مسجد کے عقبی دروازہ میں جناب حسن رضاء دفن ہیں۔

ضلع بجنور میں نہٹور کی ایک ذیلی بستی (سرکاری کاغذات کے مطابق یہ بستی نہٹور کا حصّہ نہیں ہے لیکن نہٹور سے جڑی ہوئی ہے) ترکولہ ہے۔ بٹوارہ کے بعد اس کا نام ترکولہ بھوانی ہے۔ ترکولہ میں سادات کے چند رضوی خاندان رہتے تھے۔ وہ کیوں رضوی تھے؟ اس تفصیل کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کا جواب میں آئندہ لکھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

شجرہ نسب بہت پیچیدہ اور حسّاس لیکن نہایت دلچسپ موضوع ہے۔ شجرہ مرتّبین کے لئے کئی مشکل مقام آتے ہیں۔ کئی بار یوں ہوتا ہے کہ مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے نسب سے باہر کے لوگ جعلی شجرہ کے ذریعہ مورث اعلیٰ تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ ترکی (استنبول) میں کئی گروہ جعلی نسب نامے بنانے کا کام کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ انہیں سزائیں ہوئی تھیں۔ اس طرح کا کام مفاد حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

از منہ قدیم سے دستور چلا آرہا ہے کہ لوگ خود کو طاقت کے مختلف مراکز اور نامور شخصیات سے وابستہ کر کے کسی معروف نسل کے سلسلہ نسب میں شامل ہو کر مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے شجرہ مرتّبین اور اپ ڈیٹ کرنے والوں کو اس طرح کی کاروائیوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس طرح کی کاوائیاں برصغیر میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ ان جعل سازوں کا دعٰوی تھا کہ ان کا نسب عرب ملکوں میں سے کسی نسل سے ہے۔ جب یہ لوگ اپنا دعٰوی ثابت کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے کہا کہ ہمارے بزرگ ایران یا بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جس قدیمی شخصیت سے رشتہ جوڑتے ہیں وہ اکثر کوئی سپہ سالار (مثلاً محمد بن قاسم) یا روحانی بزرگ ہوتا ہے۔ مثلاً تاریخ آرئیں میں آرائیں حضرات کا دعوی ہے کہ ان کی ہندی/پاکستانی نسل کا بانی ایک شامی کسان سلیم الراعی ہے۔ آرائیوں کا بیان ہے کہ یہ شخص محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ آیا تھا۔ روایت ہے کہ مغل بادشاہ شاہجہان نے ان لوگوں کو تلاش کرایا اور لاہور میں جمع کیا۔ انہیں شالیمار باغ کی نگرانی سونپی گئی۔ سنا ہے کہ یہ لوگ اب بھی لاہور کے نواح میں موجود ہیں۔ لیکن اس کہانی پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔ مگر آرائیوں کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

فتح سندھ کے موضوع پر دو معتبر تاریخی کتب ہیں۔ (۱) احمد البلاذری کی فتوح البلدان اور (۲) حامد بن علی کوفی کی تاریخ ہندوسندھ 'جس کا فارسی ترجمہ 'فتح سندھ' اور سندھی ترجمہ 'چچ نامہ' کے عنوان سے ہوُا۔ یہ کتاب سندھ میں وسیع پیمانہ پر زیر مطالعہ رہتی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں آرائیں خاندان کے مبیّنہ عرب بانی سلیم الراعی کا ذکر نہیں ہے۔

پاکستان کی اعوان قوم کا دعٰوی ہے کہ خاندان کے بانی قطب شاہ ہیں اور ان کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہ اور ان کی دوسری زوجہ حنفیہ سے شروع ہوتا ہے۔ پروفیسر احمد حسن دانی کہتے ہیں کہ 'اعوان' خالص مقامی لوگ ہیں اور ان کا عربی النسل ہونے کا دعٰوی درست نہیں ہے۔

اس تنازعہ کا فیصلہ کرنے کے لئے امریکہ میں مقیم آرائیں اور اعوان خاندان کے چند افراد نے رضاکارانہ اپنے خون کا DNA ٹیسٹ کرایا۔ رپورٹوں سے معلوم ہوُا کہ ان کے خون کے نمونوں کا تعلق کسی بھی عرب نسل سے نہیں ہے۔

ہندوستان بہت ساری نسلوں کا وطن تھا۔ مثلاً آریہ، دراوڑ، منگول اور Negroid۔ حیرت ہے کہ ہندوستان کی شناخت ان مشہور نسلوں کی بجائے ان کے مذاہب سے ہوئی۔ مثلاً ہندو، بدھ، جین، یہودی، زرتشتی، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ ہندوستانی آبادی کی مذہبی تقسیم ایک الگ موضوع ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہندوستانی نو مسلموں کو شروع سے ہی سماجی مسائل کا سامنا تھا۔ برہمن تو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے تھے۔ مسلمان کس کھیت کی مولی تھے؟

المیہ یہ تھا کہ خود عرب مسلمان بھی ان نومسلموں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ نومسلموں نے دو نسلیں گزرنے کے بعد خود کو عربی النسل کہنا شروع کیا۔ اس نوع کے دعوے بلوچ، پنجابیوں اور پشتونوں نے کیے تھے۔ اگرچہ سندھ میں اعوان موجود ہیں لیکن سندھی اپنے مقامی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ البتّہ سندھی انصاریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عربی النسل ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ اسلام قبول کرنے سے نسب تبدیل نہیں ہوتا۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے تو کئی مکاتب فکر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ پھر "یہ سید کہاں سے آئے ہیں؟" لیکن سیدوں کا عربی النسل اور 'آل علی اولاد نبیؐ' ہونا ثابت ہے۔ اوّل تو عرب نسلیں اپنا شجرہ نسب 'اپ ڈیٹ' کرتی رہتی تھیں۔ دوئم یہ کہ اموی، فاطمی اور عباسی

عہد کی آل رسولؐ کی وابستگیوں میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ کون کس نسب سے ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ سادات خاندان اپنے نسّاب اور نسب نامے ساتھ لے کر ہجرتیں کیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں عرب تاجر عباسیوں کے عہد سے کیرالہ، گجرات اور کچھ میں آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ داعی بھی ہوتے تھے۔ اکثر اہل قلم نے انہیں صوفیاء لکھا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل ہونے کے علاوہ 'سید' بھی ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ ۱۸۵۹ء میں قبول اسلام کا ایک بڑا واقعہ ریکارڈ پر موجود ہے۔ 'کچھ' کے علاقہ میں غیر مسلموں کی کثیر تعداد نے اجتماعی طور پر بیعت کی اور اسلام قبول کیا۔

تیرہویں اور چودھویں صدی کا ہندوستان شمال سے آنے والے حملہ آوروں کی زد میں رہا ہے۔ ان دو صدیوں میں ہندوستان کے اکثر حکمراں جنگیں ہارتے رہے ہیں۔ فاتح لشکروں کو جو تاوان 'ادا کیا جاتا تھا اس میں عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ بعد میں یہ عورتیں بطور تحفہ عراقی حکمرانوں، بغدادی اشرافیہ، حملہ آور لشکر کے منصب داروں اور سپاہیوں کے علاوہ مقامی شہریوں میں بھی تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں ایک نسبی سلسلہ اس طرح بھی چلتا تھا۔ محقّقین کہتے ہیں کہ ان ہندی عورتوں سے پیدا ہونے والی اولاد عراق سے واپس ہندوستان آکر خود کو 'عربی نسل' کہتی ہوگی۔ ہجرتوں نے ہمیشہ بھان متی کا کنبہ جوڑا ہے۔

یہ سطور لکھنے کا مقصد متعلقہ حلقوں کو خبردار کرنا ہے۔

بٹوارہ ہونے کے بعد اب ہماری چوتھی نسل میدان عمل میں ہے۔ تیکنیکی وجوہ کی بناء پر ہمارے آپس کے رشتے دھندلے پڑتے جا رہے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف آزادانہ آمد و رفت پر غیر اعلانیہ پابندی ہے۔ ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف کے پشتون جو ایک مخصوص فاصلہ پر رہائیشی ہیں آزادی سے بغیر دستاویز کے سرحد پار کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ مختلف ہے۔ دونوں طرف کے سیاست دان اقتدار کے بھوکے ہیں۔ عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ ان کے دل میں مسائل کو حل کرنے کی خواہش ہی نہیں ہے۔ پس چہ باید کرد؟

اشتعال انگیزی کے اس ماحول میں کوئی بھی معمولی سی بات یا واقعہ ایک اور جنگ کا سبب بن سکتا ہے۔ نفرت کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملکوں کے عوام اور حکومتیں ہمیشہ شکوک و شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جہاں شکوک و شبہات ہوتے ہیں وہاں امن و محبت نہیں ہوتی۔

اے عزیزو! یہ معرکہ وجود ہے۔ سیاسی مسائل کا تصفیہ ہونے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے۔ سرحد کے دونوں طرف اپنی چار (یا پانچ) نسلوں کی آبادی میں ہم نوّے فیصد عزیز و اقارب سے نہیں مل سکے۔ ہم دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کی زندگی میں اس طرح شریک نہیں رہے جس طرح شریک رہنے کا دستور ہے۔ یہ ایک بالکل نئی (عجیب و غریب) سوشل سائنس ہے جس کی بنیاد کوئی منطق ہے نہ استدلال ہے۔ اس لئے ہمیں سرحدیں کھلنے کا انتظار کیے بغیر اپنے باہمی رابطے زیادہ منظم اور مستحکم بنانے چاہئیں۔ نفرتوں کو پروان چڑھانے والوں کی مملکتیں سیاسی ہوتی ہیں جن کا ایک جغرافیہ ہوتا ہے۔ ہماری مملکت روحانی ہے جس کے چراغ آندھیوں میں جلتے اور دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اگرچہ اس صورت حال سے پورے جنوبی ایشیا کو خطرہ ہے لیکن آل سید السادات ایام کا مرکب نہیں راکب ہے، قلند کے اصول کے تحت سیاست کی اہل ہے۔ اس نے ماضی میں کسی سمجھوتہ کے بغیر دانشمندی سے اپنا وجود قائم رکھا اور مستقبل میں بھی اس سے یہی توقع ہے۔ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں۔ اس لئے اے ہم نفسو! رشتہ جاں کو جوڑے رکھو۔ تسبیح کے دانوں کو بکھرنے مت دو۔

المختصر! تاریخی حقیقت یہ ہے کہ آل سید السادات نے مدینۃ النبی اور کوفہ و بغداد کو الوداع کہہ کر ترمذ کو آباد کیا تھا۔ وہاں سے کیتھل اور ضلع بجنور کے قصبات و دیہات کا رخ کر کے نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ یہاں قدم جمانے میں صدیاں لگی تھیں۔ دنیا ہمارے نئے آبائی مسکن کی روحانی، علمی اور عسکری طاقت کو رشک سے دیکھتی تھی۔ ہم سے انتظام و انصرام میں مشاورت کی جاتی تھی۔

پھر یکا یک حالات کی آندھی نے تاریخ دہرائی۔ایک اور ہجرت نے آل سید السادات کے جے جمائے قدم اکھاڑے۔ ہم بکھرنے لگے۔ ہمارے آبائی مسکنوں کی رونقیں ماند پڑنے لگیں۔ ہماری شناخت کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ بکھرنے کا یہ عمل تادم تحریر جاری ہے۔مزید کتنے بکھریں گے، یہ مستقبل بتائے گا۔اسی لئے میرا اصرار ہے کہ حالات وواقعات کی ٹھوکروں سے بچنے کے لئے ہمیں بین البراعظمی سطح پر منظم ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ مشکل کام نہیں ہے۔

عمران متانت حسین نے اپنی پوری ذہانت سے شجرہ مرتب کر کے نسب نامہ کی تسبیح ہمارے ہاتھ میں دی ہے۔اس کا مقصد 'پدرم سلطان بود' کے نعرے لگانا نہیں ہے۔ اس کا مقصد ماضی کی شخصیات کی مثالوں کو یاد کر کے ایک نئی تاریخ کو رقم کرنا ہے۔ خاندان کو متحد اور مستحکم رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ خاندان کا ہر فرد مساوی ترقی کرے۔اس کے لئے تنظیم اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا تشخص نمود و نمائش، منصب، عہدے اور سرمایہ نہیں ہیں۔ مدینۃ النبی سے ترمذ، کیتھل، بجنور، کراچی، لندن، ٹورونٹو۔اور کولوریڈو تک ہماری شناخت علم، محنت، سخاوت، خدمت خلق اور عجز و انکسار رہے ہیں۔انہیں قائم و دائم رکھنے کے لئے جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔

اے اللہ اس کتاب میں شامل تمام مرحومین کو باغ بہشت میں داخل فرما اور ان کی لغزشوں کو معاف فرما۔جو زندہ ہیں ان سے راضی ہو جا۔انہیں نیک اعمال کی توفیق عطا کر اور ہمارے حالات درست فرما۔اے اللہ اے ہمارے رب!!

جداعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کی دعا بھی یاد آ رہی ہے:
"اے ہمارے رب! میں اپنی بیوی اور بچے کو اس (ویران) وادی غیر مزروعہ میں تیری حفاظت میں دیتا ہوں۔تا کہ یہ تیرے عبادت گزار بندے بن جائیں۔اے ہمارے رب! ان کے لئے لوگوں کے دل محبت کے جذبہ سے نرم کر دے۔اے ہمارے رب! ان کو تمام ثمرات عطا کر تا کہ یہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔

مقصد اشاعت

تاریخ کا انسانی زندگی میں بہت کلیدی اثر پڑتا ہے چاہے اسکی اجتماعیت، قومی، ملکی، علاقائی یا خاندان کی بنیاد پر ہو۔

سید عمران متانت حسین صاحب نے ایک عشرے سے زیادہ طویل عرصے کی عرق ریز تحقیق کے بعد سلسلہ زیدی کی تاریخ کو اس کتاب میں قلمبند کیا ہے۔

سلسلہ زیدی کے اشخاص کے لیے بالعموم اور سادات نہٹور کے لیے بالخصوص یہ تحقیق ایک انمول تحفہ ہے جو عرصہ دراز تک پشتہا پشت اصل حقیقت آشکار کرتی رہے گی۔

ویسے تو زیدی سلسلہ میں ان گنت لوگ قابل تقلید و ستایش ہیں، مگر عمران متانت صاحب نے بڑی ہوشمندی اور بسارت سے محض چند کا انتخاب کیا ہے شاید اس لیے کہ پڑھنے والے کے لیے طوالت ناگوار نہ گزرے۔

اس تالیف کے علاوہ سید عمران متانت صاحب نے اپنی کمپیوٹر پروگریمنگ کی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوے شجرہ سادات نہٹور اور نگینہ کے کی پہلوں کو اجاگر کیا ہے جنہیں وہ ایک دو جلدوں پر مشتمل کتابی شکل میں اکھٹا شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سید محمد خورشید عالم زیدی

کموڈور (ریٹائرڈ) پاکستان بحریہ

ستارہ امتیاز (فوج)

تعارف

سب سے پہلے میں اس کتاب کی تصنیف کا مقصد بیان کرتا ہوں لیکن بہتر ہو گا کہ پہلے اپنا مختصر تعارف اور خاندانی پس منظر بیان کر دوں۔ میرا نام عمران متانت حسین ہے اور میرے آباء واجداد کا تعلق سادات نہٹور (ضلع بجنور)۔ اتر پردیش۔ ہندوستان سے تھا۔ میرے والد صاحب شجاعت حسین مرحوم اور والدہ صاحبہ تعظیم فاطمہ کا پیشہ ورانہ تعلق درس وتدریس سے تھا اور یہ دونوں کراچی، پاکستان کے مختلف اسکولوں میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ میرے والد صاحب نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز تو نہٹور میں کیا تھا لیکن پاکستان میں تقریباً چالیس سال ملازمت کے دوران کئی لائق شاگرد پیدا کیے۔ ان میں سے سب سے ہونہار ڈاکٹر محمد علی شاہ مرحوم تھے جن کو میرے والد صاحب نے ٹیوشن بھی پڑھایا۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ ایک ماہر آرتھوپیڈک سرجن تھے اور کبھی کبھار ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'کامیابیوں کا سفر' میں میرے والد صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا بھی ذکر کیا تھا اور اس کتاب کی رونمائی میں میرے والد صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔

میرے دادا کا نام صولت حسین تھا جو متحدہ ہندوستان میں تحصیل دار تھے۔ میرے نانا کا نام محمد ابن عباس تھا جو میری دادی اعزاز فاطمہ مرحومہ کے سگے بھائی تھے اور لکھنؤ پوسٹ آفس میں مینیجر (اسٹاک ڈپو) کی حیثیت سے اثاثہ جات اور دیگر سامان کے منتظم تھے۔ میرے والد شجاعت حسین مرحوم کی طرح یہ دونوں بھی علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھ چکے تھے جب کہ میری والدہ تعظیم فاطمہ نے لکھنئو یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے دادا صولت حسین میرے نانا ابن عباس کے ماموں زاد بھائی تھے۔ اس زمانے میں قریبی رشتہ داروں میں شادی کو ترجیح دی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ روایت کم ہو گئی مگر اب بھی کچھ لوگ سادات میں ہی رشتے طے کرنا پسند کرتے ہیں۔ گو کہ میرے بزرگ اس اصول پر کاربند نہیں رہے لیکن حسن اتفاق سے میرے والدین کی تمام اولاد کی شادی خاندان میں ہی ہوئی۔

میرے دادا صولت حسین صاحب کو سیر وشکار کا بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ماہر تیراک اور گھڑ سوار بھی تھے۔ مجھے اپنے بچپن کے وہ دن اب بھی یاد ہیں جب وہ اپنے شکار کے قصے سنایا کرتے تھے۔ یہ واقعات میرے تایا شوکت حسین مرحوم نے قلم بند کر کے مارننگ نیوز اور پاکستان پر سپکٹیو میں شائع بھی کروائے تھے لیکن یہ مضامین اب دستیاب ہونا بہت مشکل ہیں۔ خاصی حد تک یہ دلچسپی دادے ابا کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد بھی ہم سب بھائیوں کو دادے ابا کی بندوقوں سے خاص لگاؤ رہا۔ دادے ابا باقاعدگی سے اپنی بندوقوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے اور ہم تینوں بھائیوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے دادا کی طرح میرے والد صاحب کو بھی تیراکی کا شوق تھا اور انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو بھی یہ گر سکھایا۔ اس کے علاوہ انہیں قدیم نوادرات سے بھی دلچسپی تھی جو مجھ میں بھی منتقل ہو گئی۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی چند سال اندرون سندھ میں گزارے اور دیہی علاقوں کے رہن سہن کا بغور مشاہدہ کیا۔ میرا قیام سوئی گیس کمپنی کی عارضی لیکن پر آسائش خیمہ بستیوں میں ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں شکار پر پابندی تھی لیکن میں نے قدرتی مناظر کا بھرپور لطف اٹھایا۔ ہر انسان کو کبھی نہ کبھی مشکلات بھی اٹھانی پڑتی ہیں جو کہ قدرت کی طرف سے ایک امتحانی مرحلہ ہوتا ہے۔ سو مجھے ستمبر ۱۹۷۶ء کے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں نے سیلاب کا پہلی بار سامنا کیا تھا۔ ان دنوں ہماری تعمیراتی کارکنوں کی خیمہ بستی جھانگارا نام کے گاؤں کے پاس واقع تھی جو کہ سیہون شریف سے ۱۵ کلومیٹر دور منچھر جھیل کے جنوب میں ہے۔ طوفان بادوباراں کے ساتھ برساتی نالے بھی بپھر کر ابل پڑے اور زمین جل تھل ہو گئی۔ بیشتر شاہراہیں اور ریل کی پٹری بھی زیر آب آ گئی تو آمد ورفت کا نظام بھی مفلوج ہو گیا۔ ہمارے رہائیشی علاقے میں بھی پانی بھر گیا اور تعمیراتی سرگرمیاں روک دی گئیں۔ ہم افسران نے وائرلیس کے ذریعے کراچی میں سوئی گیس کمپنی کے صدر دفتر کو اس ہنگامی صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ انتظامیہ نے سب افسران اور ملازمین کو کراچی بلوالیا لیکن جھانگارا سے سیہون شریف ہم سب کو کبھی کبھار کمر تک پانی میں چلنا پڑا۔ ہم صبح اپنی بستی کو خیر آباد کر کے روانہ ہوئے مگر سورج غروب ہونے کے وقت سیہون پہنچے۔ دوروز قیام کے بعد ہم نے کشتیاں کرائے پر لیں اور دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پہنچ کر بسیں پکڑ کر کراچی پہنچ گئے۔ یہ میری زندگی کا انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا لیکن سچ پوچھیے تو مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا۔

میرے نانا ابن عباس مرحوم کو فوٹو گرافی سے شغف تھا اور ہمارے خاندان کی کئی قدیم تصاویر انہوں نے اتاری تھیں جو اب تک محفوظ ہیں۔ وہ ایک ماہر عکاس تھے اور شیشے پر نگیٹو وضع کیا کرتے تھے۔ ایک حد تک مجھ میں بھی یہ شوق منتقل ہو گیا اور میں نے بھی کافی یادگار تصاویر اتاری ہیں۔ نانے ابا نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال لکھنؤ میں گزارے۔ لکھنؤ کا ماحول ادبی تھا اور ان کے کئی اہل قلم خانوادوں سے قریبی تعلقات تھے۔ ان میں سے ایک گھرانا مشہور اردو شاعر اسرار الحق مجاز کا بھی تھا۔ مجاز صاحب کی بھتیجی محترمہ صہبا لیاقت خود بھی اردو میں شاعری کرتی ہیں اور کینیڈا میں انگریزی کی پروفیسر رہ چکی ہیں۔ یہ میری خالہ عظیم فاطمہ کی ہم جماعت تھیں لیکن ٹورونٹو، کینیڈا میں میرا ان سے اب بھی رابطہ ہے۔ ہندوستانی شہری ہونے کی وجہ سے وہ ہر سال لکھنؤ ضرور جاتی ہیں۔ مرحوم رئیس امروہوی نے کیا خوب کہا ہے:

باز آئیں گے مسافر کب شوق جستجو سے
اب تک وہی ہیں رشتے دلی سے لکھنئو سے

میرے والدین کا نکاح تو ہندوستان میں ہی ہو چکا تھا لیکن رخصتی کچھ عرصے بعد ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد میرے دادا اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلے آئے لیکن میرے والد صاحب ایک بار پھر ہندوستان گئے اور میری والدہ صاحبہ کو بھی اپنے ہمراہ پاکستان لے آئے اور اس طرح میری پیدائش کراچی، پاکستان میں ہوئی۔ پیشہ ورانہ اعتبار سے میں میکینیکل انجنیئر ہوں اور سوئی

سدرن گیس کمپنی میں چیف انجنیئر کے عہدے پر فائز تھا۔ گزشتہ انیس سال سے میں اپنے خاندان کے ساتھ کینیڈا میں مقیم ہوں جہاں میں نے مزید اعلٰی تعلیم جاری رکھی اور کمپیوٹر کے شعبے میں خاص مہارت حاصل کرلی اور یہی میرا ذریعہ معاش بھی رہا۔ ہم لوگ چار شادی شدہ بھائی بہن ہیں اور میں سب سے بڑا ہوں۔ مجھ سے چھوٹے بھائی سلمان لطافت حسین ہیں جو الائیڈ بینک آف پاکستان میں وائیس پریزیڈینٹ تھے۔اس نسب نامہ کی تدوین کے سلسلے میں انہوں نے بطور خاص ہندوستان میں مقیم احباب سے رابطہ کرکے گراں قدر معلومات فراہم کیں۔ان سے چھوٹے ہدایت حسین ہیں۔ یہ اسٹیٹ لائف انشورینس کارپوریشن میں ملازمت کرتے۔ تھے۔ سب سے چھوٹی ہمشیرہ کا نام قمر سیدہ ہے جو کراچی میں ایک سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ ہم چاروں بہن بھائیوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ جدوجہد مسلسل۔ ہم سب میں مثالی ذہنی ہم آہنگی ہے اور ہم ایک دوسرے کے احساسات اور ضروریات کو سمجھتے ہوئے ہر ممکنہ مدد کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

میری اہلیہ ماہ طلعت زیدی کے آباءواجداد کا تعلق بھی سادات نہٹور سے ہے گو کہ وہ کوہاٹ، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے سندھ اور کراچی یونی ورسٹیوں سے ایم۔ایس۔ سی اور بی۔ایڈ کیا ہے۔ان کے والد مزمل حسین زیدی مرحوم سول انجنیئر تھے اور میری طرح انہوں نے بھی این۔ای۔ڈی انجنیئرنگ یونی ورسٹی کراچی سے ہی پڑھا ہے لیکن وہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کرچکے تھے اور واپڈا میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ میری خوش دامن راشدہ خاتون مرحومہ کا تعلق بھی سادات نہٹور سے تھا لیکن انہوں نے بھوپال میں تعلیم حاصل کی تھی۔ان کے چھے شادی شدہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ میری اہلیہ کے صرف ایک بھائی ان سے بڑے ہیں۔ سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر ارشد حسین امریکا میں مقیم ہیں۔ میری اہلیہ کی چھوٹی بہن ماہ رفعت نے حیدرآباد سے گریجوئیشن کیا تھا اور وہ کراچی میں مقیم ہیں۔ان سے چھوٹے بھائی افضل حسین نے برطانیہ سے ایم۔بی۔اے کیا تھا اور وہ کینیڈا میں مقیم ہیں۔ان سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر اشرف حسین سعودی عرب میں ملازم ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن عظمی زیدی نے کراچی سے گریجوئیشن کیا تھا اور یہ بھی کینیڈا میں مقیم ہیں۔

میرے تین بیٹے ہیں جو کینیڈا میں ہی فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔

-طہٰ زیدی نے یارک یونیوسٹی سے پڑھا ہے اور یہ اکاؤنٹینٹ ہیں۔ان کی اہلیہ عائیشہ احمد، واٹرلو یونیورسٹی (اونٹاریو) سے فارغ التحصیل ہوئی ہیں اور ایک مقامی بینک میں زیر معاش ہیں۔
-مرتضٰی زیدی نے واٹرلو یونیوسٹی سے پڑھا ہے اور یہ کمپیوٹر انجنیئر ہیں۔ان کی اہلیہ ایمن خان، یونی ورسٹی آف اونٹاریو انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (الیکٹریکل انجنیئرنگ) سے فارغ التحصیل ہوئی ہیں۔
- مصطفٰی زیدی نے سنٹنیل کالج سے اکاؤنٹنگ پڑھی ہے لیکن وہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد اعلٰی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور فی الحال زیر تربیت ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سینیکا کالج، ٹورونٹو میں زیر تعلیم ہیں۔

میرے ننھیال اور ددھیال کا ماحول کافی مذہبی رہا ہے۔ ہماری خاندانی روایات میں ہر فرد کو اعلٰی سے اعلٰی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ صوم صلوۃ کی پابندی کو اولیں ترجیح دی جاتی تھی اور میرے بزرگوں کا نظریہ یہ تھا کہ اچھا انسان بننے کے لئے اچھا مسلمان بننا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی آل واولاد کو دینداری اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔اس معاملے میں میرے دادے ابا کا رویہ زیادہ سخت تھا۔ نماز میں سستی کی صورت میں وہ اپنے پوتوں کو یاد کراتے رہتے تھے کہ

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

زمانہ طالب علمی میں میرا شمار ذہین طلباء میں ہوتا تھا اور میں ہمیشہ اعزازی نشانات کے ساتھ کامیابی حاصل کیا کرتا تھا۔ میٹرک کے بعد سے انجنیئرنگ کرنے تک مجھے اعلٰی کارکردگی کی وجہ سے تعلیمی وظائف ملے لیکن کینیڈا میں اعلی تعلیم کے حصول کے لئے بھی میں سرکاری طور پر مالی امداد کا حقدار قرار پایا گیا اور میں نے دو اسناد حاصل کیں۔ یہ سب میرے والدین کی اعلی تربیت کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا۔ میرے والدین کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کی اولاد حج ضرور کرے۔ اللہ تعالٰی نے ان کی یہ خواہش پوری کردی اور انہوں نے نہ صرف خود دوبار حج کیا بلکہ اپنی تمام اولاد کو بھی یہ سعادت نصیب ہوتے دیکھا۔اس کے علاوہ ہمارے خاندان میں قرآن پاک حفظ کرنے کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ میری چھوٹی بہن نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو حافظہ بھی کروایا اور وہ اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے نوسال کی عمر میں حافظ بن گیا۔ میرے بزرگ تو ان روایات کا عملی نمونہ تھے ہی لیکن گاہے بگاہے اپنی آل واولاد کو دین پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ کہاں تک حق بجانب تھے، اس کا احساس مجھے تب ہوا جب میں پاکستان سے نقل مکانی کرکے کینیڈا آگیا۔ یہاں میں نے بھی اپنی خاندانی روایات دہرانی شروع کردیں تاکہ میری اولاد بھی اس سلسلے کو جاری رکھے۔ میرے پاس دو راستے تھے۔ یا تو اپنی خاندانی اقدار یکسر فراموش کرکے اس نئے ماحول میں بس جاؤں یا اپنی آئندہ نسلوں کو ان کے قابل فخر مذہبی اور ثقافتی سرمائے سے روشناس کراتا رہوں۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور سب سے پہلے زبان پر توجہ دے کر یہ اصول اپنایا کہ گھر میں انگریزی اور گھر سے باہر غیروں کے سامنے اردو نہ بولو۔ تاہم زبان کا معاملہ محض بول چال تک محدود نہیں ہوتا اس لئے مجھے بہت جلد یہ احساس ہوگیا کہ اردو لکھنا اور پڑھنا بھی بہت اہم ہے۔ میں نے کمپیوٹر کے ذریعے اردو لکھنے پر خاص توجہ دی اور آج اسی صلاحیت کے حصول کے بعد آپ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

اندازِ بیاں گرچہ میرا شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

ہمارے بزرگوں کو اپنے اسلاف کی روایات اور خاندانی اقدار کا پاس حد درجہ ہوتا تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ آئیندہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی خاندانی نجابت اور شرافت سے روشناس کرائیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے علم نسّابی کو منتخب کیا تھا اور ہر دور میں کچھ لوگ ضروری اندراجات کرتے رہتے تھے لیکن کتابی شکل میں طباعت اور اشاعت صرف ایک ہی بار ممکن ہو سکی۔ ۱۹۶۴ء میں حافظ عبدالرشید ندوی صاحب مرحوم نے جو شجرہ سادات نہٹور پیش کیا اس میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہو پائی۔ اس نسخہ میں صرف زیدی سادات نہٹور کے ایک سلسلے کا ذکر تھا۔ گو کہ حافظ عبدالرشید ندوی صاحب مرحوم کے طبع زاد نسخے میں کثرت سے شخصیات کے علاوہ ان سے منسلک مقامات کا بھی ذکر تھا لیکن یہ نسب نامہ صرف ترمذی زیدی سادات سے متعلق تھا۔ حافظ عبدالرشید ندوی صاحب مرحوم کی تحقیقات کے مطابق، قصبہ نہٹور اور اس کے مضافات میں سادات کے کئی سلسلے آباد تھے جن کی ترمذی زیدی سادات سے قرابت داری بھی قائم تھی لیکن ان کے شجرہ نسب دستیاب نہیں تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے نہٹور اور اس کے قرب وجوار میں سادات کے کئی سلسلے مثلاً نقوی، رضوی، مشہدی، چشتی، جیلانی وغیرہ آباد تھے۔ کچھ دانشمندان بغداد کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے اور کچھ امروہہ سے بھی آئے تھے۔ میرے مشاہدے میں ایک خاص بات یہ آئی کہ سادات نہٹور کی سادات نگینہ، سیوہارہ، شیر کوٹ، جھلو وغیرہ سے کثرت سے قرابت داریاں قائم تھیں اور گاہے بہ گاہے وہ ان مقامات کی طرف نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ نہٹور نگینہ، سیوہارہ اور بجنور کے درمیان میں واقع ہے۔ اس کے باوجود، اس خطے میں کئی سادات کے سلسلوں کی موجودگی غور طلب ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے سادات نگینہ کے دو شجرہ نسب اور سادات ترکولہ کے قلمی مشجرات بھی دستیاب ہو گئے لیکن حال ہی میں مجھے امۃ الانساب (مصنفہ رضوان الدین انصاری) تک بھی رسائی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے شجرہ رسولداران اور شجرہ سادات گردیزیہ بھی موصول ہوئے ہیں۔ ترمذی سادات نہٹور کے مورث سید حسن نہٹوری کی زوجہ ثانی سعید النساء بنت میر احسن الدین زیدی کا تعلق بھی سادات گردیزیہ سے تھا۔ یہ حقیقت بھی مشاہدات میں آئی ہے کہ ترمذی سادات کے کئی اور سلسلے بھی پاکستان میں آباد ہیں اور ان میں اپنے خاندانی پس منظر کی تحقیق کا جذبہ برقرار ہے۔ ایسے کئی افراد نے مجھ سے خود رابطہ کیا اور اپنے شجرہ نسب کی تفصیلات فراہم کیں۔ اس لئے اب میری تحقیق کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے اور اب تک میں تقریباً اکیس ہزار افراد کے اندراجات مکمل کر چکا ہوں۔ شجرہ نسب دراصل خاندان کی شرافت نسبی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ایک گروہ کو دوسرے پر فوقیت دی جائے۔ محض پہچان کی غرض سے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کام کو آگے بڑھایا جائے اور اس میں قصبہ نہٹور کے علاوہ دیگر بجنوری قصبات میں واقع زیدی سادات کے نام بھی شامل کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس اشاعت میں زیدی سادات کے علاوہ رضوی، تقوی اور نقوی سادات کے سلسلے بھی شامل ہیں۔۔ میری خواہش تھی کہ سادات سیوہارہ کہ سلسلہ کو بھی اس نسب نامہ میں شامل کر لیا جائے لیکن بعض مطلوبہ معلومات دستیاب نہ ہو سکیں۔ متعلقین سے رہنمائی کی درخواست عام ہے۔

اس سے پہلے بھی میں نے سادات بجنور کے افراد کے اسماء گرامی کی ایک فہرست مرتب کر کے تقسیم کی تھی جس میں ہر فرد کا نام، زوجیت اور والدین کے نام انگریزی حروف تہجی کے مطابق درج کیے گئے تھے۔ کچھ احباب نے میری حوصلہ افزائی بھی کی تھی لیکن میں نے اس فہرست کو باقاعدہ شجرے کی شکل میں ڈھالنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور الحمد للہ آج اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

گر قبول افتد بصد عز و شرف

نسب نامے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے۔ یہ ہر خاندان کی مشترکہ میراث ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ متعلقہ افراد اس قابل فخر سرمائے میں خاطر خواہ اضافے کی خاطر اس پیشکش کی خامیوں اور فرو گزاشتوں کی نشاندہی کر کے اپنے خیالات سے نوازیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو اسے دوبارہ بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کتابی پیشکش کے کوئی جملہ حقوق محفوظ نہیں کیے اور جو خاندان کا فرد چاہے اسے طبع کرا سکتا ہے۔ صرف اتنی درخواست ہے کہ اسے من وعن شائع کیا جائے۔ بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے میں نے اس نسب نامے میں لوگوں کی ذاتی معلومات فراہم کرنے سے گریز کیا ہے۔ حقیقت میں یہ پیشکش مصنفہ نہیں بلکہ مرتبہ ہے جس میں سادات بجنور کی قرابتیں شجرے کی شکل میں بیان گئی ہیں۔ اصل متن تو انگریزی میں ہے لیکن اس کتاب میں مشاہیر ضلع بجنور کے بھی مختصر حالات اور تصاویر شامل کی گئی ہیں۔

ضلع بجنور ایک مردم خیز خطہ ہے جہاں سادات کے کئی سلسلے آباد ہیں۔ ان میں آپس میں قرابت داریاں بھی قائم ہیں لیکن یہ کتابی پیشکش صرف زیدی، رضوی، تقوی اور نقوی سادات سے متعلق ہے جن کے آباء واجداد کا تعلق ضلع بجنور، اترپردیش، ہندوستان سے ہے۔ ان لوگوں کے بزرگ یا تو وسطی ایشیائی ریاستوں سے بغرض تبلیغ دین ہندوستان تشریف لائے تھے یا عراق کے مقام واسط سے جو نجف اشرف کے قریب واقع ہے۔ ضلع بجنور ہندوستان کے شمالی صوبے اترپردیش میں اس طرح واقع ہے کہ جنوبی مغرب میں دہلی تقریباً ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) کلو میٹر دور ہے اور جنوب مشرق میں لکھنئو تقریباً چار سو ساٹھ (۴۶۰) کلو میٹر دور ہے۔ علی گڑھ بھی جنوب میں تقریباً دو سو گیارہ (۲۱۱) کلو میٹر اور مراد آباد صرف ستاسی (۸۷) کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ تفصیلات کے لئے اگلے صفحے پر نقشہ جات ملاحظہ فرمائیں:
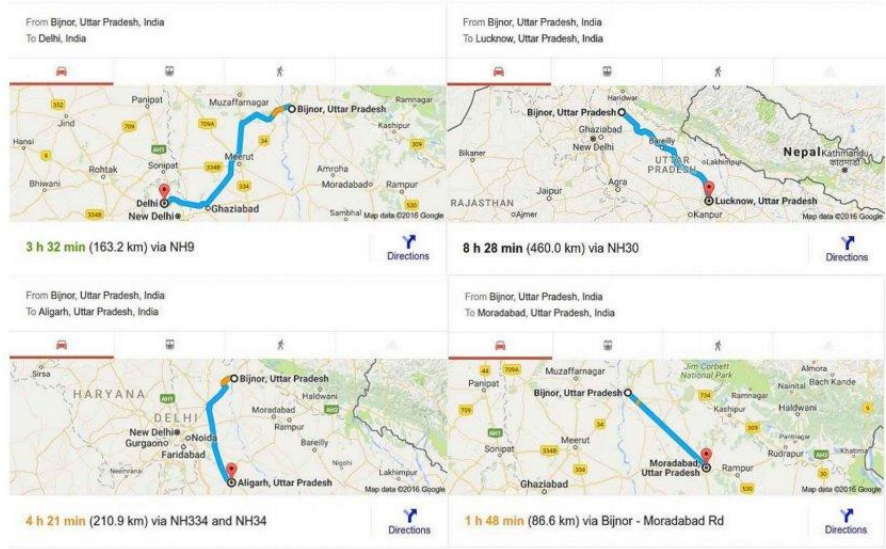
ضلع بجنور میں کئی مشہور قصبات مثلاً نہٹور، نگینہ اور سہوارہ وغیرہ واقع ہیں جہاں زیدی سادات کی ایک کثیر تعداد آباد تھی لیکن ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ان کی اکثریت پاکستان چلی گئی جہاں ان کی کئی نسلیں آباد ہیں۔ میرے آباء اجداد بھی انہی مہاجرین میں شامل تھے گو کہ میری ولادت پاکستان میں ہوئی۔

جب ہم سادات کا ذکر کرتے ہیں تو سب سے پہلے حسنین شریفین کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ تمام سادات ان دو عظیم برادران کی اولاد میں سے ہیں۔ سادات بجنور کی کثیر تعداد حسینی النسل ہے لیکن چند خاندان حسنی النسل بھی ہیں۔ حسینی سادات میں اکثریت اعقاب حضرت زید شہید بن حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالی عنہ کی ہے لیکن رضوی، تقوی اور نقوی سلسلے بھی یہاں آباد ہیں۔ یہ کتابی شجرہ مرتب کرتے وقت میں نے کئی تحقیقات سے استفادہ کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، اب تک شجرہ سادات بجنور مرتب کرنے والوں کے صرف یہ نام آتے ہیں:-

۱۔ جناب عابد حسین صاحب مرحوم۔

ان کا شجرہ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ ان کی فارسی تصنیف سات ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی لیکن ان کے جانشین اس تک دست رسائی سے قاصر رہے تاہم ان کے اخلاف میں برادر حسن مجتبٰی نے قرابت داروں کی نشاندہی میں گراں قدر خدمات فراہم کیں۔ ان کا تعلق سادات نہٹور سے تھا۔

۲۔ جناب غنی حیدر صاحب مرحوم۔

ان کا شجرہ نسب اٹھائیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ انہوں نے ایک قلمی نسخہ مرتب کیا تھا جس میں صرف مرد حضرات کے ہی نام شامل تھے لیکن نسخہ کے اختتام پر ایک صفحہ وار ناموں کی فہرست شامل تھی۔ ان کا تعلق سادات نہٹور سے تھا۔

۳۔ حافظ عبدالرشید ندوی صاحب مرحوم۔

ان کا تعلق بھی سادات نہٹور سے تھا اور ان کا شجرہ نسب انتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں، انہوں نے ۱۹۶۴ء میں پہلا شجرہ سادات مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ انہوں نے جناب غنی حیدر کے نسخہ سے استفادہ کیا تھا۔ یہ نسخہ شجرہ سادات نہٹور سے متعلق تھا جو نہٹور کے علاوہ بجنور کے کئی مقامات پر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے جد امجد حضرت کمال الدین ترمذی سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور ہندوستان کے صوبے ہریانہ میں کیتھل نامی مقام پر قیام پزیر ہوئے تھے۔ بعد ازیں، ان کی آل و اولاد میں سے ایک بزرگ حضرت سید حسن صاحب نہٹور منتقل ہو گئے تھے۔ حضرت کمال الدین ترمذی کا شجرہ نسب گیارہویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ نہٹور اور اس کے مضافات میں کئی سادات کے سلسلے پہلے سے ہی آباد تھے لیکن بیشتر نہٹوری سادات حضرت حسن نہٹوری کی اولاد میں سے ہیں۔ میرے نانا ابن عباس اور دادا اصولت حسین کے ان سے

قریبی تعلقات تھے۔ یہ مشہور نہٹوری شخصیت خلیل احمد مرحوم صاحب (ایک آنہ فنڈ والے) کے برادر نسبتی تھے۔ان کی بھانجی خالدہ خلیل کے اب بھی میری والدہ تعظیم فاطمہ سے گہرے تعلقات ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی رہائیش گاہیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں جن کے درمیان آمد و رفت کی بھی سہولت تھی۔

۴۔جناب سید ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم۔

ان کا تعلق سادات نگینہ سے تھااور ان کا شجرہ نسب تینتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ان کا طبع شدہ شجرہ واسطی زیدی سادات مقیم قصبہ نگینہ سے متعلق ہے لیکن اس کے آخری صفحات دستیاب نہیں ہیں اور اس نسخے میں بھی صرف مرد حضرات کا ہی ذکر ہے۔ان کی اہلیہ محترمہ عفت النساء کا تعلق بھی سادات نہٹور سے تھا۔ وہ میرے نانا کے بڑے بھائی شبر حسن کی زوجیت میں تھیں لیکن شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے محترم محمد اسمٰعیل سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ان کے صاحب زادے محترم جلال الدین اکبر سے میری والدہ تعظیم فاطمہ کی لاہور میں ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ جلال الدین اکبر صاحب کی اہلیہ زاہدہ بتول کے ننھیال کا تعلق بھی سادات نہٹور سے ہے۔اس نو دریافت نسخہ کے صفحہ ۲ اپر درج ہے کہ واسطی زیدی سادات کے ایک بزرگ سید ارشد علی کی شادی نہٹور میں مسماہ عمر النساد ختر سید محرم علی سے ہوئی۔ جناب ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب خود بھی ارشد علی مرحوم کی اولاد میں سے ہیں۔اس کے علاوہ صفحہ ۱۰ کے مطابق واسطی زیدی سادات نگینہ کے ایک بزرگ رئیس مشتاق علی مرحوم تھے۔ان کے پوتے اسرار علی کی شادی محترمہ رئیسہ بنت مشتاق حسین مرحوم سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے سلمان اور ہارون بھی کینیڈا میں مقیم ہیں۔ مرحوم اسرار علی زیدی کا شجرہ نسب پینتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے ملتا ہے۔اب تک اس نسب نامہ کے توسط سے کئی واسطی زیدی سادات کے مکمل شجرہ نسب کی نشاندہی کی جا چکی ہے ے۔اس نسخے کے مطابق، زیدی سادات واسطی کے جد امجد حضرت ابو الفرح واسطی تھے جو عراق میں واقع ایک مقام واسط سے اپنے مرشد سیدنا معین الدین سنجری کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے لیکن حضرت ابو الفرح واسطی کے اسلاف کے اندراجات تصحیح طلب پائے گئے۔ چنانچہ ضروری ترمیم کے بعد یہ سلسلہ نسب موجودہ اندراجات میں شامل کر دیا گیا ہے حضرت ابو الفرح واسطی کا شجرہ نسب پندرہویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ان کے فرزند نجم الدین نے چھاترو دیا چھترو دنامی مقام میں قیام کیا۔ ممکن ہے کہ اب اس مقام کا نام تبدیل ہو گیا ہو لیکن شجرے میں یہی لکھا ہے۔ یہ زمانہ بھی سلطان شہاب الدین غوری (بارہویں صدی عیسوی) کا تھا۔ حضرت ابو الفرح واسطی کے دیگر فرزندگان کے اخلاف تہن پور، کنڈی وال اور جنجیر میں آباد تھے۔ بیشتر سادات بارہ ضلع مظفر نگر، اتر پردیش میں آباد تھے لیکن ان کی اکثریت تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گئی تھی۔

۵۔مرحوم عباس علی بن شریف علی۔

ان کا تعلق بھی سادات نگینہ سے تھااور ان کے قلمی نسخے کے مطابق یہ ۱۸۹۶ء میں مرتب کیا گیا تھا۔اس نسب نامہ کی مدد سے بھی کئی واسطی زیدی قرابت داروں کے سلسلہ نسب مکمل کیے جا چکے ہیں۔ یہ شاخ بھی حضرت نجم الدین بن ابو الفرح واسطی کے اعقاب میں شامل ہے۔

٦۔ محترم رضوان الدین انصاری۔

ان کا تعلق بھوپال، بھارت سے ہے۔ سادات بجنور سے قرابت داری نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی تصنیف 'امہ الانساب' میں سادات بجنور کے مشجرات بہت خوش اسلوبی سے پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب صرف انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔اس کتاب میں نہ صرف سادات ہند بلکہ انصاریاں، صدیقیاں، فاروقیاں، عثمانیاں، پٹھان، مغل، لودھی، چنگیزی، غوری، سلیمانی، اکشواکو ونش، یدوونش اور راجپوتوں کے مشجرات بھی درج ہیں۔ میں نے ان کی تحقیق کا اپنے اندراجات سے مقابلہ کیا تو حیرت انگیز حد تک درست پایا۔انصاری صاحب کا شجرہ نسب جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔

۷۔اعظم علی زیدی۔

ان کا تعلق گجرانوالہ، پاکستان سے ہے اور یہ شہید ابراہیم شاہ بن کمال الدین ترمذی کے اعقاب میں سے ہیں۔انہوں نے اپنا مکمل شجرہ نسب مجھے فراہم کرنے کے علاوہ انساب کی کئی کتب بھی مجھے فراہم کیں۔

۸۔آغا عبد الرافع گردیزی۔

ان کا تعلق ملتان سے ہے اور یہ سلطان معبر جلال الدین زیدی کے اعقاب میں سے ہیں۔انہوں نے بھی اپنا مکمل نسب نامہ فراہم کرنے کے علاوہ کئی اہم قرابت داریوں کی نشاندہی کر کے اس اشاعت کی تدوین میں گراں قدر معلومات سے مستفید فرمایا۔ آغا صاحب نے بھی مجھے انساب کے موضوع پر کئی کتب ترسیل کیں۔

۹۔ مرحوم ریاست حسین زیدی رسولدار۔

ان کا تعلق زیدی سادات نہٹور سے ہے مگر قیام پاکستان کے بعد وہ پاکپتن شریف منتقل ہوگئے تھے اور وہیں ۱۹۸۷ء میں ان کا وصال ہوا۔ مجھے ان کے پوتے کاشان رضا زیدی رسولدار (مقیم پاکپتن شریف) نے گراں قدر قلمی مخطوطات اور کئی تاریخی کتب فراہم کیں۔ مرحوم ریاست حسین نے اپنی یادداشتیں ایک ڈائری کی شکل میں محفوظ کرلی تھیں جس میں انہوں نے تاریخ رسولداران کے علاوہ مشجرات کی شکل میں سادات رسولداران کے دیگر سادات نہٹور سے قرابت داری کو اجاگر کیا تھا۔ اس تحقیق سے استفادہ کر کے میں رضوی، تقوی، نقوی (واسطی) اور سادات رسولداراں کے اندراجات مکمل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ صاحب موصوف کا ذکر میرے اندراجات میں پہلے سے ہی موجود تھا مگر ان کے بارے میں معلومات نامکمل تھیں۔

۱۰۔ محترم خورشید عالم زیدی۔

ان کا تعلق سادات نہٹور سے ہے اور ان کا شجرہ نسب بتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ دور حاضر میں یہ سب سے زیادہ زور نسابت کے حامل ہیں۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے شجرہ سادات نہٹور کے اندراجات کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ دلچسپی رکھنے والے حضرات کو بھی کمپیوٹر کے ذریعے نسابی کے اسرار و رموز سکھائے اور اپنے گراں قدر تحقیقی سرمائے تک رسائی فراہم کی۔ ان کے فیض سے شاید مجھے ہی سب سے پہلے بہرہ ور ہونے کا اعزاز حاصل ہوا اور گزشتہ بیس سال سے ہم ایک دوسرے سے معلومات کا تبادلہ کررہے ہیں۔ نہ صرف انہوں نے حافظ رشید ندوی کے شائع شدہ نسخے سے استفادہ کیا بلکہ انہوں نے اپنی تحقیق کا مرحوم عابد حسین صاحب کے قلمی نسخے سے بھی تقابلہ کیا۔ جناب سید ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب کا مرتب کردہ شجرہ واسطی سادات بھی ان ہی کی دریافت ہے۔ انہوں نے نہ صرف نام اور مقامات درج کیے بلکہ بیشتر افراد سے رابطے کے حوالے کے میں بھی ضروری معلومات اکھٹا کیں۔ محترم خورشید عالم زیدی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے شجرہ سادات میں خواتین کے نام بھی شامل کیے۔ ان کے والد محمد عالم زیدی مرحوم میرے دادا صولت حسین کے ماموں زاد بھائی تھے۔

۱۱۔ مرحوم ہاشم رضوی۔

ان کا تعلق سادات ترکولہ سے تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سے خاندان پاکستان کوچ کر گئے تو یہ بزرگ شجرہ نسب مکمل نہ کرسکے لیکن ان کی قلمی یادداشتیں اب بھی دستیاب ہیں۔ کیونکہ سادات بجنور کی باہمی قرابت داریاں مدتوں سے قائم ہیں، اس لئے تلاش بسیار کے بعد میں نے رضوی سادات بجنور سے تعلق رکھنے والے بیشتر خانوادوں کا غیر منقطع شجرہ نسب بھی اپنے اندراجات میں شامل کرلیا ہے۔ اس تحقیق کے دوران یہ عقدہ بھی کھلا کہ ضلع بجنور میں رسولداران، تقوی اور واسطی نقوی سادات سے بھی گہری قرابت داری قائم ہے۔ تقوی اور نقوی سادات بجنور کے روابط سادات امروہہ سے وابستہ ہیں۔ سادات امروہہ سے تعلق رکھنے والے حسن ہادی صاحب نے اپنی ذاتی ویب سائٹ پر کئی سلسلہ نسب شائع کیے ہیں جن میں میرے مطلوبہ افراد بھی شامل ہیں۔ اس طرح میں تقوی اور واسطی نقوی سادات سے تعلق رکھنے والے کثیر قرابت داروں کے غیر منقطع نسب نامے مکمل کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔

۱۲۔ عمران متانت حسین زیدی۔

میرا شجرہ نسب چوتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں، میں نے کافی حد تک محترم خورشید عالم زیدی کے تحقیقی سرمائے سے استفادہ کیا ہے۔ اندراجات میں کثیر اضافے کے علاوہ میں نے تاریخی حوالہ جات بھی اکھٹا کیے ہیں اور ایک عرصہ دراز کے بعد پہلی بار شجرہ سادات بجنور کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ اس مجموعے میں انیس ہزار (۱۹۰۰۰) سے زیادہ افراد شامل ہیں۔ یہ کتاب دراصل حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے آباء و اجداد سے شروع ہوتی ہے لیکن اس میں ان کی تمام آل و اولاد کا بھی ذکر آتا ہے جو کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نقل مکانی کر گئے تھے یا ان سے بیرونی قرابت داریاں قائم ہوگئی تھیں۔ چنانچہ اس کتاب میں سادات کے علاوہ غیر سادات کے بھی نام شامل ہیں۔ سادات میں تو اکثریت زیدی افراد کی ہے لیکن اس کے علاوہ رضوی، نقوی، کاظمی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ غیر سادات میں صدیقی، فاروقی اور خان وغیرہ نمایاں ہیں۔ یہ امتزاج سادات بجنور کی تنوع پسندی کی بھی علامت ہے کہ انہوں نے اتحاد بین المسلمین کی مثال قائم کرتے ہوئے اپنے تشخص کو بھی برقرار رکھا۔ گو کہ بہت سے سادات کا تسلسل رسول اللہ صلی علیہ وسلم تک مکمل نہیں ہے لیکن ان کی آل و اولاد کا تذکرہ سید کی حیثیت سے ہی کیا گیا ہے۔ کل سادات کے نام کے ساتھ سید کا سابقہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اردو متن کے ابتدائی صفحات مقصد تصنیف کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں جب کہ انگریزی متن میں خاندان کی چنیدہ شخصیات کی تصاویر بمعہ مختصر احوال بھی شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی حروف تہجی کے مطابق ناموں کی فہرست شامل کی گئی ہے۔ ہر فرد سے ایک مخصوص عدد وابستہ ہے جو اس کے تشخص کی نشاندہی کرتا ہے۔

۱۳۔ محترمہ ڈاکٹر سیدہ سہیلہ مشرف صاحبہ۔

ان کے ننھیال کا تعلق سادات نہٹور سے ہے لیکن انہیں بھی نسابی سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کا شجرہ نسب تینتیسویں پشت میں حضرت زید شہید سے مل جاتا ہے۔ یہ امریکا کے سر کردہ ماہرین امراض قلب کی صف میں شامل ہیں۔ تاحال میں ان کی تحقیقات سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی غیر طبع شدہ تصنیف قلمی نسخے کی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔ لکھنؤ میں ان کے نانا مستحسن سعید صاحب کے بھی میرے ننھیال سے گہرے تعلقات تھے اور ان کی ایک خالہ حمیدہ مرحومہ کی میری والدہ تعظیم فاطمہ سے گہری دوستی تھی۔ لکھنؤ میں ان کی رہائیش گاہیں بھی ایک دوسرے ملحق تھیں اور آمد و رفت کے لئے بھی اندرونی دروازے موجود تھے۔

حضرت زید شہید کی آل و اولاد مختلف ادوار میں کئی ممالک سے ہندوستان پہنچی۔ ان میں سے کچھ خانوادے تو ہندوستان کے شمالی علاقہ جات (بشمول ضلع بجنور) میں مقیم ہو گئے اور کچھ جنوبی ہندوستان میں۔ یہ سب حضرت زید شہید کے دو بیٹوں یعنی حضرت حسین ذوالدمعہ اور حضرت عیسٰی موتم الاشبال کی اولاد میں سے تھے۔ رسولدار، ترمذی اور گردیزی تو حضرت حسین ذوالدمعہ بن زید شہید کے اعقاب میں سے ہیں لیکن سادات نگینہ کا تعلق حضرت عیسٰی موتم الاشبال بن زید شہید سے ہے۔ سادات نگینہ دراصل سادات بارہہ کی ایک شاخ ہیں جن کے مورث اعلی حضرت ابوالفرح واسطی تھے۔ حضرت حسین ذوالدمعہ کی آل و اولاد صرف ضلع بجنور تک ہی نہیں منتقل ہوئی بلکہ کچھ لوگ ملتان، پاکستان میں بھی مقیم ہو گئے۔ یہ لوگ گردیزی کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ان میں شامل سادات رسولدار کے آباء و اجداد بھی واسط، عراق سے ہندوستان آئے تھے لیکن ایک شاخ نہٹور، بجنور میں آباد ہو گئی۔ زیدی سادات بارہ کی بھی سادات بجنور سے قرابت داری تھی۔ مشہور نہٹوری مصنفہ قرۃ العین حیدر نے اپنی سوانح کار جہاں دراز ہے میں لکھا ہے کہ سادات بارہ کے ایک بزرگ اسد اللہ کی صاحبزادی فضیلت النساء کا عقد جناب محمد تقی علی سے ہوا تھا جو سادات نہٹور کے بزرگ حسن نہٹوری کے پوتے تھے۔

میں آئیندہ آنے والے صفحات میں خاندان کی مشہور شخصیات کا بھی تذکرہ کروں گا لیکن اس نسب نامے کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا:-

تصویر ادھوری ہے ابھی کاوش ناکام
لفظوں میں خیالات کے پیکر نہیں آتے

عمران متانت حسین
بی۔ای (مکینیکل)، ڈپلوما (کمپیوٹر پروگرامنگ)، گریجویٹ سرٹیفیکیٹ (بایو انفار میٹیکس)
تاحیات رکنیت۔ پاکستان انجنیئرنگ کاؤنسل، انسٹیٹیوشن آف انجنیئرز (پاکستان)
سابقہ چیف انجنیئر۔ سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ

Sert. No. 182 — سیٹ نمبر ۱۸۲

کراچی یونیورسٹی

University of Karachi

FACULTY OF ENGINEERING
Bachelor of Engineering

کلیۂ انجینیرنگ
بی۔ای

Whereas SYED IMRAN MATANAT HUSAIN S/O SYED SHUJAAT HUSSAIN has pursued a course of study prescribed by this University for the Degree of Bachelor of Engineering MECHANICAL in the Faculty of Engineering and has passed the requisite Annual/~~Supplementary~~ examination of 1974, held in 1975, having been placed in 1ST class.

It is hereby certified that he/she has been duly admitted to the degree of Bachelor of Engineering MECHANICAL in this University.

Registrar — Vice-Chancellor

Dated Karachi, the 13TH AUGUST 1979

Note:- Detailed transcripts of examination results have been issued separately

برگاہ ... ولد ... نے کلیۂ انجینیرنگ کے تحت بی۔ای میکانِک کی سند کیلئے اس جامعہ کے منظورہ نصاب کی تکمیل کرلی ہے اور مطلوبہ امتحان سالانہ/ضمنی ۱۹۷۴ منعقدہ ۱۹۷۵ میں کامیاب ہوکر اوّل درجہ حاصل کرلیا ہے لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ انھیں اس جامعہ میں بی۔ای میکانِک کے درجہ پر فائز کیا گیا

شیخ الجامعہ — مسجل

کراچی بتاریخ ۱۳ اگست ۱۹۷۹

The Institute of Engineers Pakistan

№ 007341

BUILD A BETTER WORLD — ESTD. 1948

By this **Diploma** Warrants

That SYED IMRAN MATANAT HUSSAIN (M/5084)
S/o SYED SHUJAAT HUSSAIN
was duly elected MEMBER (MECHANICAL) of the Institute and is fully entitled to all the privileges granted by the Constitution and Bye-laws.

Date of Enrolment 5.1.1981

President — Honorary General Secretary

PAKISTAN ENGINEERING COUNCIL

Serial No: PEC—4 10139

Registration No : Mech/2236
Date of Registration : 1.9.1979

CERTIFICATE OF REGISTRATION
UNDER
PAKISTAN ENGINEERING COUNCIL ACT 1975

This is to certify that Engr. SYED IMRAN MATANAT HUSAIN son of Syed Shujaat Hussain born on 22nd Aug. 1953 resident of V-C-8/1, Nazimabad Karachi-18 present professional address V-C-8/1, Nazimabad, Karachi-18 has been registered as Professional Engineer/~~Consulting Engineer/Temporary Licencee~~, at serial no. Mech/2236 of the Register of Pakistan Engineering Council with following Particulars:

Qualifications : B.E. (Mechanical) 1976

Professional Affiliation with status : I

Specialisation/Training/Attainments :

Date of issue 26/11/79

Registrar
Pakistan Engineering Council.
P. O. Box 1296 Islamabad.

Note:- The Certificate of registration shall expire on 31st December 19.79......and will be renewed on payment of required fee before 31st January for the next year.

Training Certificate

This is to Certify That
Syed Imran Matanat Husain
of
Sui Southern Gas Company Limited
Has Successfully Completed a
4 Weeks (June 6 - June 27, 1996)
NOVA Gas International Training Program Entitled:
Facility Design & Project Management

August 16, 1996
Date

Barry Upigrove
Pakistan Training Manager

NOVA Gas International
Calgary, Alberta, Canada

CENTENNIAL COLLEGE

Imran Husain

has fulfilled the requirements of the prescribed program of study and under the authority of the Board of Governors has been granted an

Ontario College Graduate Certificate in

Bioinformatics for Software Professionals

December, 2011

The Institute for Computer Studies

THIS IS TO CERTIFY THAT

Syed Imran Matanat Husain

HAS FULFILLED ALL THE REQUIREMENTS OF THE INSTITUTE FOR COMPUTER STUDIES FOR THE DIPLOMA OF:

Computer Programming, Database and Internet Solutions Developer

IN WITNESS WE HAVE HERETO SUBSCRIBED OUR NAMES AND AFFIXED THE ACADEMIC SEAL OF THE INSTITUTE
TORONTO, CANADA

SIGNATURE
DATE May 26, 2000

اترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی کل اولاد علوی ہے لیکن صرف فاطمی اولاد ہی سادات کہلاتی ہے۔ ہر فاطمی علوی ہے لیکن ہر علوی فاطمی نہیں۔
نسب کے اعتبار سے سادات کی دو قسمیں ہیں:

حسنی سادات:

حسنی سادات، امام حسن مجتبیؑ کے فرزندوں کو کہتے ہیں۔

حسینی سادات:

حسینی سادات، امام حسینؑ کے خاندان سے ہیں۔ یہ تمام افراد حضرت امام زین العابدینؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کی بھی کئی شاخیں ہیں جیسے عابدی، باقری، زیدی، جعفری، موسوی، رضوی، تقوی اور نقوی۔ سادات بجنور کی بیشتر تعداد زیدی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے لیکن کچھ افراد جعفری، رضوی اور سلسلے سے بھی وابستہ ہیں۔ زیدی اور رضوی سادات میں قدیم قرابت داری قائم ہے ان میں سے بیشتر کے مکمل نسب نامے دستیاب ہیں۔ اس حصے میں چند اہم ہستیوں کا ذکر ہے۔

—

اترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا

مناجات کمالیہ [1]

مندرجہ ذیل مناجات حضرت کمال الدین ترمذی سے منسوب ہے اور زیدی سادات نہٹور کے بزرگوں کے معمولات میں رہی ہے۔ محترم عابد حسین اور حاجی محمد خلیل نے جو اکابرین میں سے ہیں اس دعا کے بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہونے کے متعلق اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ اس منظوم دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دوسرے مصرے کے آخری الفاظ آیات قرآنی ہیں۔

[2]خداوندا اکبر سمیعا بصیرا	بقدرت علی کل شئ قدیرا	[3]دہی مومناں را از اکرام وافر	بہ جنت نعیما و ملکا کبیرا
[4]درآں ملک باشد ہوائے قوی خوش	درونیست شمسا ولازم ھریرا	[5]بجمد یکستو طٰہٰ و یٰسین بداوی	کلاہ سراو سراجا منیرا
[6]بنص قرآن آمر کردہ بمومن	کہ ذکرم بگویند ذکرا کثیرا	[7]غضب بر منافق گہے درد رآید	ببطن جہنم وساءت مصیرا
[8]کسے راکہ بر پشت نامش رسانی	فید عو سبورا و یصلی سعیرا	بروزیکہ از قبر بیروں شوند	بہ محشر چو خیر ندا کثر نفیرا
چہ داند کسے حال درماند گاں را	تو دانی کہ ہستی علیما بصیرا	[9]بمثل کلامت کہ گفتن تواند	ولو کان بعضا لبعض ظھیرا
کسے راکہ نامش دہی بر یمینش	بلطف تحاسب حسابا یسیرا	کسے را کنی صادق الوعد او	شود ایمن از شرہ مستطیرا
درآں روز یارب بفریاد من رس	نباشم جو مورا علی قمطریرا	کمال حسینی بسا جرم وارد	توئی عفو کن یا لطیفا خبیرا

1 بشکریہ "ہمارے اسلاف"، تصنیف شکیل احمد زیدی، ۱۹۹۱ء۔ دستہ بندی کی خصوصی ملحوظات جو بزرگوں میں دیکھی سنی گئیں وہ یہ ہیں۔
2 علم دوست
3 صلح کل
4 فرض شناس
5 خدمت گزار
6 حق گوئی
7 متواضع و غریب پرور
8 منظم
9 حق شناس

حضرت حسین بن علی بن ابی طالب[10]

نام ونسب: اسمِ گرامی: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ۔ کنیت: ابو عبداللہ۔ القاب: ولی، زکی، طیب، مبارک، ریحانۃ الرسول ﷺ، سبط الرسول ﷺ۔ شہید، سید، التابع المرضات اللہ۔ سلسلہ نسب: امام حسین بن امیر المؤمنین علی المرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ والدہ کی طرف سے امام حسین بن سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہابنت سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم۔

تاریخِ ولادت: آپ کی ولادت باسعادت تین شعبان المعظم /۴ھ، بمطابق ۵/ جنوری ۶۲۶ء کو مدینۃ المنورہ میں ہوئی۔

سیرتِ مبارکہ: علم وعمل، زہد وتقوے، جود وسخا، شجاعت وقوت، اخلاق ومروّت، صبر وشکر، حلم وحیاوغیرہ صفات کمال میں بوجہ اکمل اور مہمان نوازی، غرباءپروری اعانتِ مظلوم، صلۂ رحم، محبتِ فقراءومساکین میں شہرہ آفاق تھے۔ پچیس حج پاپیادہ کیے، دن رات میں تین ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور کثرت سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ آپ اتنے باجمال تھے کہ جب تاریکی میں بیٹھتے تو آپ کی پیشانی اور رخساروں کی روشنی سے راستے منور ہو جاتے تھے۔ آپ سینہ سے لے کر پاؤں تک مشابہ بہ جسم رسول پاک ﷺ تھے۔ (خزینۃ الاصفیاء: ۷۳)

فضائل ومناقب: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "حسین منی وانا من الحسین احب اللہ من احب حسینا، حسین سبط من الاسباط"۔ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں، اللہ تعالیٰ اس شخص کو محبوب رکھتا ہے، جو حسین سے محبت رکھے، حسین (میری) اولاد میں سے ایک فرزند ارجمند ہے۔ (جامع ترمذی: ۳۷۷۴)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہم انی احبہ فاحبہ یعنی الحسین"۔ اے اللہ میں اس حسین سے محبت کرتا ہوں، تو بھی حسین سے محبت فرما۔ (مسند امام احمد بن حنبل: ج،۵: ۱۰۵)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من احب الحسین فقد احبنی" جس نے حسین سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ (مسند امام احمد بن حنبل)

حسینیت ویزیدیت: حضرت امام عالی مقام کی شہادت کا پہلا پیغام عملی جدوجہد کا پیغام ہے۔ محبت حسین رضی اللہ عنہ کو فقط رسمی نہ رہنے دیا جائے بلکہ اسے اپنے عمل وحال وقال میں شامل کر لیا جائے اور اپنی زندگی کا مقصد بنایا جائے، یعنی معلوم کیا جائے کہ یزیدی کردار کیا ہے اور حسینی کردار کیا ہے۔ یزید نے کھلم کھلا اسلام کا انکار نہیں کیا تھا اور نہ ہی بتوں کی پوجا کی تھی، مسجدیں بھی مسمار نہیں کی تھیں۔ وہ بھی اسلام کا نام لیتا تھا۔ یزیدی کردار یہ ہے کہ مسلمان بھی ہو اور اسلام سے دھوکہ بھی کرے۔ نام اسلام کا لے اور عمل کافروں والا ہو۔ اسلام اور مسلمانوں سے دھوکہ وفریب یزیدیت کا نام ہے۔ یزید ہر دور میں میں ہوتا ہے۔ صرف چہرے بدلتے ہیں، کردار ایک ہی ہوتا ہے۔

پہلے حسینی کردار کی تجلی اپنے اندر پیدا کرو، سیرت حسین کو اپنے سینے پہ سجالو، پھر اس قوت حسینی سے یزیدی کردار کی مخالفت اور اس کا مقابلہ کرو۔ یزیدیت کے بتوں کو پاش پاش کر دو۔ اس کے لیے اگرچہ تمہیں مال، جان، اور اپنی اولاد کی قربانی ہی کیوں دینا پڑے۔ یزیدیت کا مقدر شکست ہے، اس کیلئے صرف جذبۂ صادق چاہیے۔

تاریخِ شہادت: بروز جمعۃ المبارک، ۱۰/ محرم الحرام ۶۱ھ، بمطابق اکتوبر/۶۷۹ء کو مقامِ کربلا پر سجدے کی حالت میں جامِ شہادت نوش کیا۔ آپ کا مزار پرانوار "کربلا" عراق میں ہے۔

10 http://www.ziaetaiba.com/ur/scholar/hazrat-imam-hussain-bin-ali-al-murtaza

آل رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مدینہ سے شام تک سفر، لحظہ بہ لحظہ، شہر بہ شہر

حسینی سادات (امامیہ)

تاریخ وصال	تاریخ پیدائش	اسم مبارک
۱۰ محرم ۶۱ ہجری	۳ شعبان ٤ ہجری	حضرت امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ
۲۵ محرم ۹۵ ہجری	۵ شعبان ۳۳ ہجری	حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالٰی عنہ
ذی الحج ۱۱٤ ہجری	۱ رجب ۵۷ ہجری	حضرت امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ تعالٰی عنہ
۱۵ شوال ۱٤۸ ہجری	۱۷ ربیع الاول ۸۳ ہجری	حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالٰی عنہ
۲۵ رجب ۱۸۳ ہجری	۷ صفر ۱۲۸ ہجری	حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالٰی عنہ
۱۷ صفر ۲۰۳ ہجری	۱۱ ذی القعد ۱٤۸ ہجری	حضرت سیدنا امام علی رضا رضی اللہ تعالٰی عنہ رضوی سادات ترکولہ / نہٹور آپ کی اولاد میں سے ہیں
۲۹ ذی القعد ۲۲۰ ہجری	۱۰ رجب ۱۹۵ ہجری	حضرت سیدنا امام تقی الجواد رضی اللہ تعالٰی عنہ تقوی سادات امروہہ / نہٹور آپ کی اولاد میں سے ہیں
۳ رجب ۲۵٤ ہجری	۵ رجب ۲۱٤ ہجری	حضرت سیدنا امام علی نقی رضی اللہ تعالٰی عنہ نقوی سادات امروہہ / نہٹور آپ کی اولاد میں سے ہیں
۸ ربیع الاول ۲۶۰ ہجری	۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ ہجری	حضرت سیدنا امام حسن عسکری رضی اللہ تعالٰی عنہ
۸ ربیع الاول ۲۶۰ ہجری (اختلاف)	۱۵ شعبان ۲۵۵ ہجری	حضرت سیدنا امام مہدی رضی اللہ تعالٰی عنہ

[11]

11 أعمدۃ الانساب (مصنفہ رضوان الدین انصاری، بھوپال، بھارت)

12حضرت علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (زین العابدین)

نام و نسب: اسمِ گرامی: سید علی۔ کنیت: ابو محمد، ابوالحسن۔ لقب: سجاد، سید الساجدین، زَین العابدین، امین۔

سلسلہ نسب: حضرت امام علی زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین بن امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم۔ آپ کی والدہ کا اسمِ گرامی: شہر بانو بنت یز گرد ہے۔ تاریخ ولادت: آپ بروز جمعرات ۵ شعبان المعظم /۳۳ھ، بمطابق جنوری/۶۵۹ء کو مدینۃ المنورہ میں پیدا ہوئے۔

سیرتِ مبارکہ: آپ اپنے جدامجد حضرت امیر المؤمنین حضرت علی ضی اللہ عنہ کے ہم شبیہ تھے، دو سال تک اُن کے آغوش میں تربیت پائی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جب اِن کو دیکھتے تو فرماتے "مرحبایاحبیب ابن الحبیب"۔
سعید بن المسیّب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کہ میں نے اِن سے زیادہ کسی کو متورع نہیں دیکھا۔
ابن شہاب زُہری رضی اللہ عنہ اور ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: کہ ہم نے اِن سے زیادہ افضل وفقیہ کسی کو نہیں پایا۔ (طبقات الحفاظ)
امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ یہ اہل فضل میں سے تھے، ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحیح اور افضل ترین وہ تمام اسانید ہیں جو زہری رضی اللہ عنہ نے اِن سے، اور انہوں نے اپنے والد ماجد سے، اور اُنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہیں۔ (طبقات الحفّاظ) اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ تابعین سے تھے، ثِقہ، مامون، کثیر الحدیث، عالی قدر، رفیع منزلت، پرہیز گار، عابد اور خائف من اللہ تھے۔ (طبقات ابن سعد) ابو الائمہ اور سید التابعین تھے، واقعہ کربلا میں موجود تھے، لیکن بوجہ علالت شریکِ قتال نہ ہو سکے، دنیا کی لذتوں کو ترک کیا ہوا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد آپ کو کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ جب بھی اس واقعہ فاجعہ کی یاد آتی تھی، آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی لگ جایا کرتی تھی۔ جب وضو کر کے نماز کے لیے تیار ہوتے تو چہرہ مبارک زرد ہو جاتا، اور جسم کانپنے لگتا، دِن رات میں ہزار رکعت نماز پڑھتے۔ (اس لئے سجاد لقب ہوا) دِن کو روزہ رکھتے، اور شام کو صرف ایک پارۂ نان (روٹی کا ایکٹکڑا) پر اکتفا کرتے، رات کو ایک ختم قرآن شریف بھی کیا کرتے، سخاوت پوشیدہ کرتے، راتوں کو آٹے و روٹیوں کا بوجھ پشت مبارک پر لے کر مستحقین میں خیرات بانٹا کرتے، یہاں تک کہ پشت پر سیاہ داغ پڑ گئے تھے۔

وصال: آپ کا وصال ۲۵/ محرم الحرام ۹۵ھ، بمطابق اکتوبر ۷۱۲ء کو مدینۃ المنورہ میں ہوا۔ جنت البقیع میں حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی الہ عنہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حضرت زید شہید [13]

آپ سیّد السّاجدین حضرت زین العابدینؒ کے پرہیز گار اور متقی فرزند ارجمند تھے۔ حضرت زید بن علی کی ولادت باسعادت حضرت زین العابدینؒ کے بیت الشرف واقع مدینہ منورہ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ ولادت پر مختلف مورخین کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔ مشہور محقق ابن عساکر نے ان کی تاریخ ولادت ۷۸ ہجری جبکہ ایک اور مورخ محلی ان کی تاریخ ولادت ۷۵ ہجری لکھتے ہیں۔ چند مورخین کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۸۰ ہجری بنتی ہے۔ ابن عساکر نے اپنی کتاب تھذیب تاریخ دمشق الکبیر کی جلد ۶ کے صفحہ ۱۸ پر لکھا کہ آپ کی شہادت ۴۲ سال کی عمر میں سن ۱۲۰ھ میں ہوئی اس حساب سے آپ کا سال ولادت باسعادت ۷۸ھ ہی بنتا ہے۔ لیکن شیخ مفید اپنی کتاب مسار الشیعتہ میں ان کا سال شہادت اول ماہ صفر ۱۲۱ھ لکھا۔ مشہور کتاب مسند امام زید جو کہ حضرت زید بن علی کی شرح احوال کے بارے میں ہے اس میں آپ کا سال ولادت باسعادت ۷۶ھ جبکہ سال شہادت ۱۲۲ھ درج ہے۔ اس طرح آپ کی عمر ۴۶ سال بنتی اور زیدی سادات اس کو درست تسلیم کرتے ہیں اور یہی تاریخ قرین قیاس ہے۔

حضرت زید شہید بن زین العابدینؒ کے والد حضرت زین العابدینؒ (علی بن الحسین) ہیں۔ آپ حضرت حسینؒ کے فرزند تھے اور ایرانی بادشاہ یزد جرد کی بیٹی شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ آپ حضرت حسینؓ کے اکیلے فرزند تھے جو کربلا میں زندہ بچ گئے تھے۔ آپ بھی اپنے والد کے ساتھ کربلا میں تشریف لائے تھے لیکن چونکہ سخت بیمار تھے اور ہتھیار اٹھانے اور جنگ میں شرکت کرنے کی طاقت نھیں رکھتے تھے اسی لئے جہاد اور شہادت سے معزور رہ گئے تھے اور حرم کے قیدیوں کے ساتھ شام بھیج دیئے گئے۔

حضرت زید بن علی کی والدہ کے نام کے بارے میں مختلف مورخین کی مختلف آراء ہے۔ کچھ نے ان کا نام غزالہ لکھا اور کچھ ان کا نام "جیّد" یا "جیدا" لکھتے ہیں۔ کچھ محققین ان کو "حیدان" جبکہ خود حضرت زین العابدینؓ ان کو "حوراء" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک نیک اور پرہیز گار خاتون تھیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے مختار بن ابی عبیدۂ ثقفی نے ان کا انتخاب حضرت زین

12 http://www.ziaetaiba.com/ur/scholar/hazrat-imam-zain-ul-abideen

13 حضرت زید شہید و شجرہ زیدی سادات
مؤلف و مرتب: ڈاکٹر سکندر عباس زیدی
سال تالیف: ۲۰۱۲ء

العابدینؑ کے لیے کیا تھا۔ حضرت زین العابدینؑ سے ان کی اولاد میں تین بیٹے زید، عمر، علی اور ایک بیٹی خدیجہ شامل تھی۔ حضرت زید بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ایک دوسری روایت کے مطابق پیغمبر اکرم کے چوتھے جانشین وتاجدار امامت حضرت علی ابن الحسین زین العابدین نے ۶۸ھ میں سندھ کی شہزادی سیدہ حوریہ سے عقد فرمایا جن سے آپ کے جلیل القدر فرزند حضرت سیدنا زید ابن علی تشریف لائے جو مؤرخین میں زید شہید کے نام سے معروف ہیں اور جن کی نسل زیدی سادات کہلاتی ہے۔اس کے باعث سرزمین سندھ حضرت زین العابدین کا سسرال اور حضرت علی بن ابی طالبؑ کا سمدھیانہ ہونے کا بھی اعزاز رکھتی ہے اور یہ دھرتی زیدی سادات عظام کا ننھیال بھی ہے۔اسی شہزادی نے آستانہ امامت میں تین پھول اور بھی مہکائے جن کے اسمائے گرامی سیدنا حسن بن علی، سیدنا حسین بن علی اور سیدنا علی ابن علی ہیں۔

زید ابن علی نے حضرت علی بن ابی طالب کی پڑپوتی سیدہ ریطہ دختر سیدنا ابوہاشم عبداللہ فرزند حضرت محمد حنیفہ بن حضرت علی سے عقد فرمایا۔اس طرح ان کا سلسلہ تین واسطوں سے حضرت علیؑ سے جاملتا ہے۔ حضرت ابوہاشم کا شمار اپنے دور کے نامور بزرگوں میں ہوتا تھا۔ حضرت ریطہ کا شمار خاندان ہاشمی کی معزز اور محترم خواتین میں ہوتا ہے۔ان کے بطن سے حضرت یحییٰ بن زید شہید پیدا ہوئے۔

حضرت ریطہ کے علاوہ بھی حضرت زید ابن علی نے کئی عقد کیے تھے۔ان کی ایک اور زوجہ محترمہ کا نام سکن تھا اور ان کا تعلق نوبہ سے تھا.ان کے بطن سے حضرت عیسی (موتم الاشبال) بن زید پیدا ہوئے۔

حضرت زید ابن علی کی ایک اور زوجہ ام ولد کے نام سے مشہور ہیں۔ان کے بطن سے حضرت حسین بن زید ذوالدّمعہ یاذی العبرہ پیدا ہوئے۔

حضرت زید ابن علی کی ایک اور زوجہ بھی ام ولد کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کا تعلق سندھ سے تھا۔ان کے بطن سے حضرت محمد بن زید پیدا ہوئے۔

اس طرح حضرت زید ابن علی کی اولاد میں چار بیٹے ہوئے:

- حضرت حسین بن زید ذوالدمعہ
- حضرت عیسی بن زید، موتم الاشبال
- حضرت یحیی بن زید
- حضرت محمد بن زید

تاریخ کی معتبر کتب میں تحریر ہے کہ حضرت زید بن علی بہت خوبصوت اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔آنکھیں بڑی اور سیاہ جبکہ ابرو کشیدہ جس سے آپ کی شخصیت دوسروں سے نمایاں نظر آتی تھی۔ بچپن ہی سے بہت ذہین اور لائق تھے آپ روحانی کمالات و معنوی جمالات کے ساتھ ساتھ شجاعت حیدر کرّار کے بھی وارث تھے۔زیدی سادات کا سلسلہ نصب اپنے جد بزرگوار حضرت زید شہید سے جاملتا ہے۔

یزید کے بعد ہشام بن عبدالملک بادشاہ ہوا اس کا دور حکومت ۱۰۵ ہجری سے ۱۲۵ ہجری تک ۲۰ سال قائم رہا اور جس قدر ظلم کا امکان تھا آل محمد (ص) پر ظلم کیا گیا۔بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آکر انھوں نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا.امام ابو حنیفہ نے حضرت زید بن علی کے خروج کے موقع پر ان کی مالی مدد کی اور لوگوں کو بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے کہا۔ حضرت ابو حنیفہ کا فتوٰی یہ تھا" خروجی بضاھی خروج رسول اللہؐ یوم بدر"[14] (حضرت زید بن علی کا اس وقت اٹھ کھڑے ہونا رسول اللہؐ کی بدر میں تشریف آوری کے مشابہ ہے)۔جناب زید بن علی بن الحسین کی شہادت اسی کے دور کا المیہ ہے۔ سلمان بن عبدالملک مروان کے حکم سے آپ کو بیدردی سے شہید کیا گیا۔تاریخ ابن الوردی میں ہے کہ عراق کے والی یوسف بن عمر ثقفی نے زید شہید کا دھڑ سولی پر چڑھا دیا دشمن کا جذبہِ انتقام اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ دفن ہونے کے بعد ان کی لاش کو قبر سے نکالا گیا اور سر کو جدا کر کے ہشام بن عبدالملک کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا۔وہاں یہ سر صدر دروازے پر معلق رہا۔اس کے بعد لاش کو سولی دی گئی اور پھر سولی سے اتار کر در کوفہ پر لٹکا دیا گیا۔اور چار برس تک مظالم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔تاریخ خمیس میں ہے کہ جب زید شہید کا برہنہ جسم دار پر چڑھایا گیا تو مکڑی نے جالا لگا کر ان کی شرم گاہ کو چھپا دیا۔اس کے بعد لاش کو سولی سے اتار کر آگ میں جلا دیا گیا اور راکھ کو ھوا میں اڑا دیا گیا۔دنیا کہتی ہے کہ واقعہ کربلا میں اتنے مظالم نہیں ہوئے۔روایات میں ہے کہ ہشام بن عبدالمالک کے حکم پر آپ کا سر مبارک تن سے جدا کیا گیا جب آپ کے سر مبارک کو آپ کے ساتھیوں کے سروں کے ہمراہ پہلے شام اور شام سے مدینہ لایا جارہا تھا تو مدینہ کے راستے میں اردن میں حجاز اور شام کو متصل کرنے والی قدیم سلطنتی شاہراہ پر واقع موتہ کے شمال میں ۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر قدیم شہر رومی میں واقع قصبہ میں جناب زید شہید کا سر مبارک کے دفن کا مقام ہے جس کا نام "ربہ" ہے جہاں حجاز اور شام کو متصل کرنے والی قدیم سلطنتی شاہراہ گزرتی ہے۔مزار پر نصب ایک پتھر کی تختی پر کندہ تھا کہ یہ

---

14 طاغوت سے انکار از اوریا مقبول جان، ۲۰ مئی ۲۰۱۶

قبر مبارک زید بن علیؑ بن حسینؑ بن علی ابن ابی طالبؑ کی ہے جسے بندہ حقیر سلمان قانونی نے تعمیر کیا۔ یہ پتھر کی سل اب تک شہداء موتہ کے مزارات کے میوزیم میں موجود ہے۔اس روایت کی مقامی افراد اب تلک تصدیق کرتے ہیں۔ معتبر تواریخ بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ آپ کا سر مبارک مدینہ پہنچنے سے پہلے دفن ہوا۔ان سروں کے دفن ہونے کے بعد یہ مقام مسلمانوں کے مبارک قبرستان میں تبدیل ہوگیا۔ جہاں اب بہت سی شخصیات دفن ہیں۔ مصدقہ حوالوں کے مطابق فاطمی حکومت کے عہد میں یہاں روضہ تعمیر کیا گیااور جس کی تجدید عثمانی حکومت کے سلطان سلیمان قانونی نے کی۔

حضرت زید کے بعد آپ کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کی بیعت کی گئی۔ حضرت یحییٰؒ نے بھی ۱۲۵ھ میں خروج کیا پھر جب آپ مقتول ہوئے تو بعد میں عبداللہ ابن حسن ابن علی بن ابی طالبؑ کے دونوں بیٹوں محمد اور ابراہیم کی بیعت کی گئی۔ عبداللہ بن حسنؒ امام ابو حنیفہ کے محترم استاد تھے۔ پھر ابراہیم نے عراق میں خروج کیا اور محمد نے مدینہ میں اسی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ کو عراق میں اور امام مالکؒ کو مدینہ میں بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

آپ کی وفات کے بعد ایک مستقل فرقہ وجود میں آگیا جو زیدیہ کہلایا۔اس فرقہ کے ماننے والوں کی اب بھی کافی تعداد موجود ہے۔ یہ فرقہ خلافت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور امامت کو بھی مانتا ہے۔امام کے متعلق بھی ان کا نظریہ کافی حد تک معتدل تھا۔ان کے نزدیک امامت منصوص بالوحی نہیں ہوتی بلکہ ہر فاطمی، عالم، زاھد، بہادر، سخی اور حق کے راستہ میں جہاد کی قدرت رکھنے والا امام ہو سکتا ہے اگر وہ مطالبۂ خلافت کے لیے سلاطین کے خلاف خروج کی اہلیت رکھتا ہو۔اس لحاظ سے ان کے ہاں امامت عملی چیز تھی سلبی نہیں۔ زیدیہ اصحابِ رسولؐ کی تکفیر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے ائمہ کو الوہیت یا رسالت کے منصب پر فائز کرتے تھے۔ تعدّدِ خلفاء کے بارے میں زیدیہ کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ دو الگ الگ ملکوں میں دو جداگانہ امام پائے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ایک ہی ملک میں دو خلفاء کا وجود ممکن نہیں۔ زیدی مذہب شیعہ، حنفی، اور معتزلی افکار کا آمیزہ ہے۔

علم کلام، فقہ اور حدیث وغیرہ پر آپ کی دس سے زیادہ تصانیف موجود ہیں۔

- کتاب «الصفوہ» و مسئلہ امامت
- مجموع الفقہی
- القلہ والجماعہ
- المجموع الحدیثی
- تفسیر غریب القرآن
- اثبات الوصیہ
- قرائتہ الخاصہ
- قرائہ جدہ علی بن ابی طالب
- منسک الحج
- الصفوہ
- اخبار زیدؒ خطبہ لمّہ

[15] مقبرہ منسوب بہ زید بن علی در کوفہ

16

15 زید بن علی:http://fa.wikishia.net/view/زید_بن_علی

حضرت حسین بن زید ذوالدمعہ

آپ حضرت زید کے دوسرے بڑے فرزند تھے آپ کی کنیت ابوعبداللہ جب کہ ذوالدمعہ یاذی العبرہ یعنی (صاحب اشک) آنسوں والا اور ربیب امام صادقؑ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے والد کی دردناک شہادت پر اکثر گریہ زاری کرتے تھے اس لئے اُن کو (صاحب اشک) یا آنسوؤں والا کہا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آخری عمر میں ان کی بینائی ختم ہوگئ۔ ان کی عمر ۷۶ سال تھی۔ جو ۱۱۴ یا ۱۱۵ ہجری قمری میں ملک شام میں پیدا ہوئے ان کی والدہ کا نام ام ولد تھا۔ صاحب علم شخصیت رکھتے تھے۔

وہ سات سال کے تھے کہ والد شہید ہوگئے۔ والد کی وفات کے بعد امام جعفر صادقؑ آپ کی پروش اور تربیت فرمائی۔ علم و حکمت کا درس دیا اس طرح انہوں نے امام جعفر صادقؑ کی شخصیت سے بہت زیادہ کسب وفیض حاصل کیا۔ حسین بن زید نے حضرت عبداللہ بن حسین کے بیٹوں محمد اور ابراہیم کے ہمراہ قیام کیا ایک مدت تک گوشہ نشین رہے اور ۷۶ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ آپ کے بیٹوں میں یحیی مشہور ہوئے۔ جو کہ دلیر اور شجاع انسان تھے۔

یہ ترمذی، گردیزی اور رسولداراں سادات کے مورث اعلیٰ تھے۔

حضرت عیسی بن زید، موتم الاشبال[17]

عیسی بن زید جو کہ موتم الاشبال کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی کنیت یحیی اور ابوالحسن تھی۔ وہ ۱۰۹ھ کو شام میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے بارے میں لکھا گیا کہ جب حضرت زید خلیفہ ہشام کے دور میں اپنی ذوجہ محترمہ جن کا نام سکن تھا اور ان کا تعلق نوبہ سے تھا ان کے ہمراہ مدینہ سے شام کے سفر پر جا رہے تھے راستے میں ایک عیسائی راہب کی عبادت گاہ کے نزدیک قیام کیا۔ اسی رات عیسی بن زید کی ولادت ہوئی۔ اتفاق سے وہی دن حضرت عیسی علیہ السلام کے ولادت کا تھا۔ اسی مناسبت سے آپ کا نام عیسی رکھا گیا۔ اسدور علماء کے مطابق آپ اپنے دور کے بڑے دانشمند، عظیم عالم، متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے چند اشہار کا تذکرہ کتاب "معجم شعراء الطالبیین" میں ملتا ہے۔ ان کا شمار روایان حدیث و فرامین معصومین میں ہوتا ہے جن کو انہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی تربیت سے حاصل کیا۔ والد کی شہادت کے وقت وہ صرف بارہ سال کے تھے۔ خلیفہ منصور عباسی کے شر سے محفوظ رہنے کے لے کوفہ میں گمنامی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی یہاں تک کہ منصور کی موت کے بعد اور اس کے بیٹے مہدی اور پوتے ہادی عباسی کے دور میں گوشہ نشینی میں مختلف مشاغل میں گزر بسر کی۔ تاکہ سقائی کا کام انجام دیا۔ آپ کی ذوجہ کا نام خدیجہ تھا جو علی بن عمر بن علی بن الحسینؑ کی بیٹی تھیں۔

اس دور کے لوگوں نے آپ کو موتم الاشبال یعنی خونخوار شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا کا لقب دیا اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ جنگ بصرہ سے فارغ ہو کر کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو راستے میں ایک خونخوار شیر نے آپ پر حملہ کر دیا۔ عیسی نے شجاعت علوی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر کا جوانمردی سے مقابلہ کیا اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر کے لوگوں کو اس کے خوف اور ظلم سے نجات دلائی۔

یہ سادات بارہہ بشمول واسطی سادات نگینہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

---

16 حضرت زید شہید و شجرہ زیدی سادات
مؤلف ومرتب: ڈاکٹر سکندر عباس زیدی
سال تالیف: ۲۰۱۲ء

17 حضرت زید شہید و شجرہ زیدی سادات
مؤلف ومرتب: ڈاکٹر سکندر عباس زیدی
سال تالیف: ۲۰۱۲ء

حضرت یحییٰ بن زید[18]

زید شہید ابن علی نے مولا علی مشکل کشا، شیر خدا کی پڑپوتی سیدہ ریطہ دختر سیدنا ابوہاشم عبداللہ فرزند حضرت محمد حنیفہ بن امام علی سے عقد فرمایا اور "صاحبِ سیف و قلم" "سیدنا یحییٰ بن زید، ۱۰۷ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ روحانی کمالات و معنوی جمالات کے ساتھ ساتھ شجاعت حیدر کرّار کے بھی وارث تھے۔ ایران کا شہر تنکابن جو کہ بعد میں صوبہ گیلان کا حصہ بن گیا اور جس کی حدود چالوس تک جاملتی ہیں وہاں دوسری صدی ہجری کے آغاز تک یہاں کے لوگوں کا مذہب زرتشتی تھا۔ عرب خلفاء عمر بن العلاء (۱۴۵-۱۵۷ھ) کے دور میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے اور سیدنا یحییٰ بن زید نے مذہب حقہ کی ترویج کی۔ صفوی (شاہ عباس اول) حکومت کے دور میں جو زیدیہ فرقہ کی طرف مائل تھے امامیہ کی طرف راغب ہوئے۔ ان کے بیٹوں میں علی اور عمر تھے۔

سیدنا یحییٰ بن زید نے اپنی انتہائی مختصر زندگی اہداف اسلامی کے دفاع اور دشمنان دین خدا کے ظلم و ستم گری کے خلاف نبرد آزما رہتے گزار دی اور اپنے عظیم الشان والد کے نقش قدم اپناتے ہوئے شہادت پائی۔ آپ اہل علم میں ''سیفُ الاسلام'' کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔

آپ نے دشمنانِ اسلام، بنی امیہ کی حکومت کی بنیادیں متزلزل کردیں۔ حیدری خون، قصرِ سفیانیت فتح کرنے لگا۔ آپ نینوا سے مدائن اور مدائن سے خراسان تشریف لے گئے۔ قیامِ خراسان کے دوران آپ نے کچھ دلیرانہ معرکوں کے بعد اپنے اثرورسوخ قائم کرلیا اور حضور نبی کریم کے افکار و سیرتِ عالیہ کو اہل خراسان میں پھیلانا شروع کیا۔
اہل خراسان مین آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھ کر دشمنان اسلام اور منافقین کو آپ کا وجود مسعود سنگین ترین خطرہ محسوس ہوا اور اس خطرے کے پیش نظر والیءہرات، نصر بن سیار اور والیء خراسان سلم بن احوذمازنی نے آپ پر حملہ کردیا۔ آپ کے جانثار ساتھی داد شجاعت دیتے شہید ہوتے گئے اور بالآخر بروز جمعہ، ۱۲۵ ہجری اپنے دادا سیدنا امام عالیمقام، امام حسین کے وقتِ شہادت، بوقت عصر خراسان اور ہرات کے درمیان واقع جوزجان میں، کنپٹی پر تیر لگنے کے باعث آپ کی شہادت ہوگئی۔

بلاشبہ یہ سیف الاسلام، سیدنا یحییٰ بن زید شہید کا امت مسلمہ پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کے نورانی تبرکات و ملفوظات کو عام فرمایا اور ان کی خاطر صرف اٹھارہ برس کی عمر میں شہید ہو کر سولی چڑھادیئے گئے۔

یحیی ابن زید گنبد کاووس میں مدفون ہیں۔[19]

---

18 حضرت زید شہید و شجرہ زیدی سادات
مؤلف و مرتب: ڈاکٹر سکندر عباس زیدی
سال تالیف: ۲۰۱۲ء

19 http://maktab-almahdi.iran.sc/cat/۱۵

حضرت محمد بن زید[20]

آپ حضرت زید شہید کے چھوٹے بیٹے تھے۔آپ کی والدہ کا تعلق سندھ سے تھا۔ علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہترین مقرر تھے۔ان کی کنیت ابو جعفر اور ابو عبداللہ تھی۔ محمدؐ بن زید کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں. آپ کی ذوجہ فاطمہ تھی جو علی بن جعفر بن اسحاق بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کی بیٹی تھی۔

اولاد:

بیٹے: جعفر، قاسم، حسن، حسین، علی اور محمدؐ
بیٹیاں: فاطمہ ،ام الحسن اور کلثوم.
آپ کے بیٹے جعفر بڑے عالم اور فقیہ اور ادیب اور شاعر مشہور تھے۔ جو کہ بعد میں نیشاپور میں مقیم ہوئے۔

امام زادہ محمد ابن زید۔ گتوند خوزستان[21]

---

20 حضرت زید شہید و شجرہ زیدی سادات
مؤلف و مرتب: ڈاکٹر سکندر عباس زیدی
سال تالیف: ۲۰۱۲ء

21 http://www.panoramio.com/photo/٤٤٤٥١٥٦٣

حضرت علی رضا بن موسیٰ کاظم[22]

نام ونسب: اسم گرامی: امام علی بن امام موسیٰ کاظم۔ کنیت: ابوالحسن۔

القابات: صابر، ولی، ذکی، ضامن، مرتضیٰ اور سب سے مشہور لقب امام علی رضا ہے۔ آپ حضرت سیدنا امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر اور آئمہ اہل بیت میں آٹھویں امام ہیں۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے: حضرت امام علی رضا بن حضرت امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن علی امام زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین بن حضرت علی المرتضیٰ (رضوان اللہ تعالی عنہم اجمعین)۔ آپ کی والدہ کے ناموں میں اختلاف ہے۔ مثلاً: نجمہ، اروی، شمانہ، ام البنین، استقراء۔ اصح "نجمہ" ہے۔ یہ حضرت حمیدہ والدہ محترمہ حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کی کنیز تھیں۔ (بارہ امام: ۱۶۶)

ولادت کی بشارت: ایک رات حضرت حمیدہ نے سرکارِ دوعالم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ نے فرمایا: اپنی کنیز نجمہ کا نکاح اپنے بیٹے موسیٰ کاظم سے کردو۔ اللہ اس سے ایک ایسا بیٹا دے گا جو روئے زمین کے بہترین انسانوں میں سے ہوگا۔ آپ کی والدہ ماجدہ فرماتی ہیں کہ جب میں حاملہ ہوئی تو کبھی بھی اپنے شکم میں گرانی محسوس نہ کی اور جب میں سوجاتی تو اپنے شکم سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آواز سنتی جس سے میرے دل میں خوف کا غلبہ طاری ہوجاتا لیکن جب میں بیدار ہوجاتی تو پھر کوئی آواز سننے میں نہ آتی تھی۔ (خزینۃ الاصفیاء: ۱۰۰/اقتباس الانوار/بارہ امام ۱۶۶)۔

تاریخِ ولادت: آپ کی ولادت باسعادت بروز جمعرات ۱۱/ذی القعد ۱۴۸ھ، مطابق ۱۲/مارچ ۷۶۵ء کو مدینۃ المنورہ میں ہوئی۔

تحصیلِ علم: آپ علیہ الرحمہ خاندانِ نبوت کے چشم وچراغ اور ان کی علمی وروحانی وراثتوں کے مالک تھے۔ اپنے والد گرامی اور فقہاء ومحدثینِ مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاو تکریما) سے تمام علوم دینیہ کی تحصیل وتکمیل فرمائی۔ آپ رحمۃ اللہ تعالی علیہ نہایت ہی ذہین وفطین اور اعلیٰ درجے کے عالم وفاضل تھے۔ آپ رحمۃ اللہ تعالی علیہ کو رب کریم نے فہمِ قرآن کی عظیم دولت سے ایسا نوازا تھا کہ آپ اکثر سوالات کے جوابات آیاتِ قرآنی سے دیا کرتے تھے۔ آپ اپنے وقت کے عظیم محدث اور فقیہ تھے۔ (جامع کرامات اولیاء: ج ۲، ص، ۳۱۲)

سیرت وخصائص: امام الھدیٰ، منبع جود وسخا، جانشین مرتضیٰ، وارث علوم وکمالاتِ مصطفیٰ ﷺ، لختِ جگر سیدہ فاطمۃ الزہرا، جامع کمالاتِ علمیہ وروحانیہ، عارف اسرار ورموزِ قرآنیہ حضرت امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہما۔ آپ رضی اللہ عنہ جامع کمالات اور عظیم اوصاف کے مالک تھے۔ اللہ جل شانہ نے آپ کو صوری ومعنوی خوبیوں سے بے حساب مالامال کیا تھا۔ پہلی مرتبہ دیکھنے والا ہی محسوس کرلیتا تھا کہ یہ خاندان نبوت کا چشم وچراغ ہیں۔ جب کسی موضوع پر سخن فرماتے تو علم کے دریا بہاتے، جب مامون کی مجلس میں ایک سوال کیا گیا، قاضیوں کی ایک جماعت جواب نہ دے سکی، جب آپ نے جواب ارشاد فرمایا تو حاضرین وسامعین عش عش کر اٹھے، اور علماء کو آپ کے علم وفضل اور تفقہ فی الدین کا علم الیقین ہوگیا، اور خلیفہ مامون نے آپ کے علمی کمالات دیکھ کر اپنی صاحبزادی کا اسی وقت آپ سے نکاح کردیا۔ (شریف التواریخ)

تاریخِ وصال: امام علی رضا رحمۃ رضی اللہ عنہ کو انگوروں میں زہر ملا کر دیا گیا جس سے آپ ۱۷/صفر ۲۰۳ھ کو شہادت سے سرفراز ہوئے۔ آپ کا مزار شریف مشہد مقدس (ایران) میں ہے۔

یہ رضوی سادات ترکولہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

22 http://www.ziaetaiba.com/ur/scholar/hazrat-imam-ali-raza-bin-imam-musa-kazim

حضرت سیدنا امام تقی الجواد

نام ونسب: محمد۔کنیت ابو جعفر (ثانی)۔القاب تقی اور قانع ہیں۔ سلسلہ نسب ہے محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب۔آپ کی والدہ کا نام حضرت ریحان یا سکینہ یا خیزران تھا۔

تاریخِ ولادت: آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ رجب ۱۹۵ھ ہوئی۔

تحصیل علم:۔ علم و عمل، زہد و تقوٰی میں اپنے آباء واجداد کی علمی و روحانی امانتوں کے امین و وارث کامل تھے۔

سیرت وخصائل:۔کم عمری کے باوجود آپ کی عدیم المثال معلومات کے سبب خلیفہ مامون رشید اور ہم عصر علماء کرام میں آپ کا احترام اس حد تک بڑھا کہ مامون رشید نے اپنی دختر آپ سے بیاہ دی۔ آپ سادگی پسند تھے اور خلیفہ وقت کے داماد ہونے کے باوجود شاہی محل میں قیام کے بجائے اپنی عام رہائش گاہ میں رہنا پسند کیا۔درس وتدریس کی غرض سے آپ مدینہ منورہ بھی تشریف لے گئے جہاں مدینہ آپ نے عقد ثانی بھی فرمایا لیکن اس دوران مامون رشید کی وفات ہو گئی۔

تاریخ وصال:۔آپ کا وصال ۲۹ ذی القعد ۲۲۰ھ میں ہوا۔

یہ تقوی سادات ترکولہ اور خاندان دانشمندان کے مورث اعلیٰ تھے۔
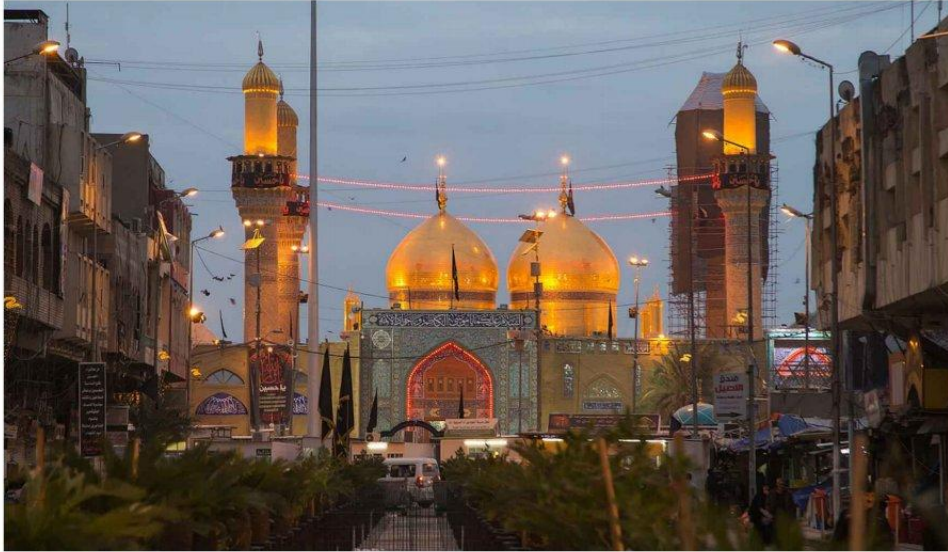
حضرت سیدنا امام علی نقی

نام و نسب: سید علی۔ کنیت ابوالحسن۔ القاب نقی، ہادی، ذکی، عسکری، متوکل، ناصح، فقیہ، امین، طیب۔ سلسلہ نسب ہے علی نقی بن محمد بن علی بن موسٰی بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب۔ آپ کی والدہ کا نام حضرت سمانہ ہے۔

تاریخِ ولادت: آپ کی ولادت باسعادت ۵ رجب ۲۱۴ھ ہوئی۔

تحصیل علم:۔ علم و عمل، زہد و تقوٰی میں اپنے آباءواجداد کی علمی و روحانی امانتوں کے امین و وارث کامل تھے۔

سیرت و خصائل:۔ آپ علم و عمل، فضل و احسان، تقوٰی، سخاوت، شجاعت میں مثل اپنے آباء کے تھے۔ اس خاندان کی محبت کو ایمان کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اقتدار پرست لوگ آپ کی شان و شوکت دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو جاتے تھے لیکن آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ جو بھی آیا خالی ہاتھ نہ گیا۔ آپ نے ساری زندگی دین اسلام کی خدمت اور نشرواشاعت میں گزاری۔ ہر قسم کی دنیاوی عہدوں، منصبوں اور دنیاداروں سے دور رہتے تھے۔

تاریخ وصال:۔ آپ کا وصال ۳ رجب ۲۵۴ھ میں سامرہ، عراق میں ہوٗا۔

یہ نقوی (واسطی) سادات نہٹور کے مورث اعلٰی تھے۔
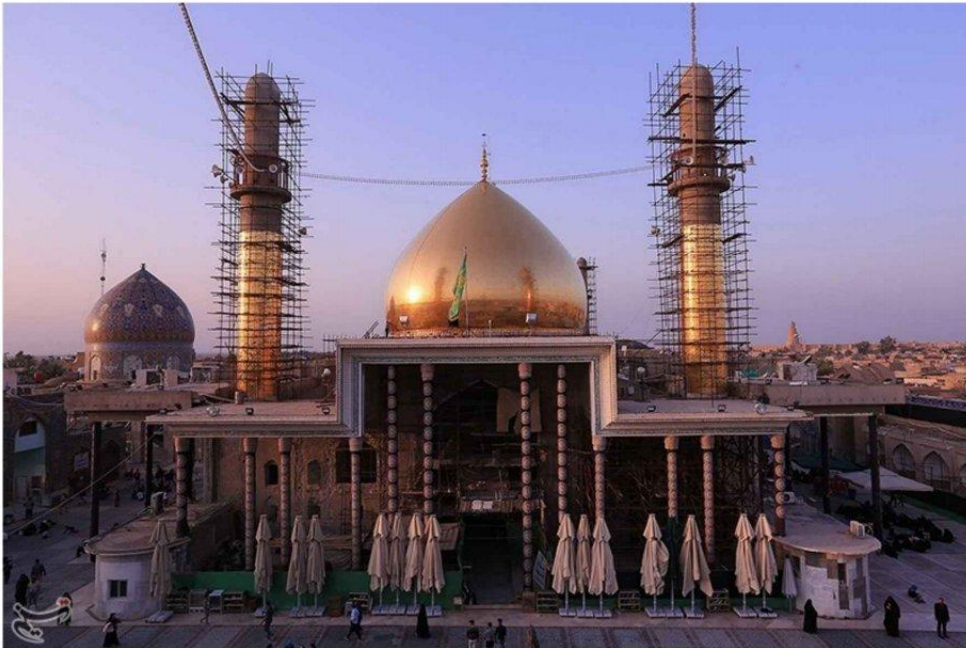
حضرت کمال الدین ترمذی[23]

بدانکہ سید السادات عالی خاندان والا دودمان مقدس احفاد احمد مختار و بزرگ ترین اولاد حیدر کرار میر سید کمال الدین ترمذی بن سید عثمان بن سید ابا بکر بن سید عبداللہ بن سید محمد طاہر بن سید ابو طاہر بن سید عبداللہ ثانی بن سید علی زید بن سید حسن ظفری بن سید احمد محدث بن سید عمر الاعلی بن سید یحیٰی محدث بن حسین ذوالدمعہ بن سید ابوالحسن زید بن حضرت سید الساجدین امام زین العابدین بقیہ اہل بیت رسول کریم پسر سید الشہداء سبط رسول اللہ یعنی حضرت امام حسینؓ بن حضرت علی مرتضیٰؓ۔

ان کے بزرگ کب اور کیسے ترمذ وارد ہوئے، اس کے بارے میں تاریخی حقائق ناکافی ہیں۔ قرۃالعین حیدر اپنی سوانح "کار جہاں دراز ہے" میں رقم طراز ہیں کہ ایک بزرگ سید حسین بن ابو عبداللہ محدث بن سید احمد محدث نے ترمذ کو اپنا وطن بنایا (جلد اوّل، صفحہ ۱۰، ۱۸)۔

آپ کیتھل میں اولین اولیائے کرام میں سے ہیں جو بارہویں صدی عیسوی میں بلخ اور غزنی سے ہوتے ہوئے براستہ لاہور کیتھل میں قیام پذیر ہوئے۔ جب کہ لاہور میں آپ کے چچازاد بھائی سید احمد توفتہ ترمذی آکر آباد ہوئے۔ اس وقت یہاں کا حکمران راجہ پرتھوی راج تھا۔

[24]آپ کیتھل پہنچ کر تالاب امبکا سے ملحقہ شاہی باغ میں قیام پذیر ہوگئے۔ چند دن بعد راج کماری انبکادیوی (جو کہ پرتھوی راج کی بیٹی تھی) جب سیر و تفریح کے لئے باغ میں آئی تو اس نے اجنبی درویش مسلمان کو مصروف عبادت پایا۔ جب حضرت سے ہم کلامی کی نوبت آئی تو راج کماری ان کی گرویدہ ہوگئی اور بعد ازاں آپ کی نگاہ کیمیا کے اثر سے مشرف بہ اسلام ہوگئی۔ شجرہ سادات نہٹور میں درج ہے کہ راج کماری نے باطناً اسلام قبول کیا تھا۔ جب راجہ کو معلوم ہوا تو بہت سیخ پا ہوا اور آپ کو طرح طرح سے تنگ کیا۔ نوبت جنگ و جدال تک پہنچی اور اس معرکہ میں آپ کے جانثار ساتھیوں نے جام شہادت نوش کیا تو آپ نے اس کے حق میں بددعا کی جس کی بدولت اس کی راج دھانی سیلا کھیڑا زبردست زلزلے سے تباہ و برباد ہوگئی۔ سیلا کھیڑ کیتھل کے مضافات میں دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھا اور زمانہ قدیم میں بڑا بارونق شہر تھا۔ شجرہ سادات نہٹور کے مطابق راج کماری کا مزار دہلی دیرینہ میں متصل خانقاہ حضرت خواجہ بختیار کاکی فریب لات کے روشن اور ہویدا ہے۔

پس واضح ہو کہ سید باکمال سید کمال الدین ترمذیؒ واسطے دعوت اور ظاہر کرنے دین اسلام کے آغاز ۵۸۸ھ میں متوجہ خطہ ہندوستان ہوئے حتیٰ کہ قصبہ کیتھل میں پہنچ کر بمقام سیلہ گڑھ استقامت کیا اور ایک ہزار آدمیوں کو شرف اسلام سے مشرف کیا کہ ان کے سرداروں کے نام بھی تاہنوز حصار سیلہ گڑھ میں مشہور و زبان زد خلق ہیں اور دیوار حصار پر مرقوم ہیں۔

آپ کے اخلاف کے نام یہ ہیں۔

حضرت ملک قطب الدین:۔ آپ کا مرقد مبارک تالاب ملک سریر کیتھل میں واقع و منور ہے۔ آپ کی اولاد بلقب ملک قصبہ کیتھل و فیض آباد میں مشہور ہے۔ آپ کے صرف ایک لڑکی تھی اور اس دختر نیک اختر سے محمد عارف پیلی والا برگزیدہ زمان متولد ہوا۔ اس بزرگوار کے صرف ایک دختر مسماہ حفیظن تھیں جو میر سید محمود سادات بونڈری سے منعقد ہو کے صاحب اولاد ہوئیں۔

سید حسام الدین مدفون کیتھل:۔ آپ کی اولاد قصبہ کیتھل، احمد آباد اور فیض آباد میں ہے اور قرابت داری خاندان قادریہ کیتھلی سے ہوتی ہے۔

سید مغیث الدین یا نعت الدین، خورد سال، مدفون کیتھل۔

سید جلال الدین غازی:۔ آپ روہیل کھنڈ تشریف لے گئے۔ آپ کی اولاد ضلع بجنور (مشرقی) بالخصوص قصبہ نہٹور میں بکثرت آباد ہے اور باعزاز عہدہ جلیلہ پر ممتاز۔ میر سید اشرف گنج بخش آپ کے فرزند مشہور معروف گزرے ہیں۔

---

23 شجرہ سادات نہٹور، از حافظ عبد الرشید، ۱۹۶۴ء

24 http://www.shah-kamal.com/urdu.htm
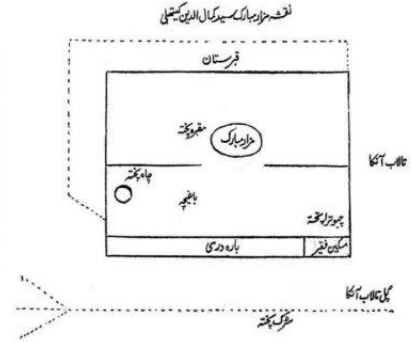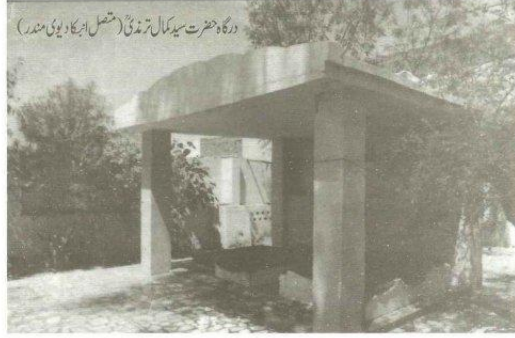
حضرت ابراہیم شاہ[28]

سید صاحب کو بعض مجبوریوں کی بناپر عارضی طور پر ترمذ واپس جاناپڑااس لئے وہ اپنی جگہ اپنے بیٹے سید ابراہیم شاہ کو سلطان شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر حملہ کی مہم میں بخوشی شریک کر دیا۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری نے اسلام کے اس جاں باز مجاہد کو فوج کا علم ونشان دے کراور کمانڈر بنا کر قلعہ ہانسی کی طرف کوچ کا حکم دیااور سید کمال الدین صاحب فتح یابی وکامرانی کی دعائیں دے کر ترمذ کے لئے روانہ ہوگئے۔ میر ابراہیم شاہ نے بکمال جراءت ہزارہا کفار کو تہ تیغ کر کے قلعہ ہانسی پر قبضہ کر لیالیکن بقضائے الٰہی مرتبہ شہادت بھی حاصل کیا۔ مرحوم کا مزار قلعہ کے اندر جنوبی مشرقی گوشہ میں ہنوز مرجع خواص وعوام بناہوُاہے اور نشانچی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ اب کھنڈرات کی شکل اختیار کر چکاہے اور اب قدیم آثار مٹ چکے ہیں۔

قلعہ ہانسی[29]

---

28 شجرہ سادات نہٹور، از حافظ عبدالرشید، ۱۹۶۴ء

29 http://theideaofindia.in/hansi-forgotten-fort-haryana/
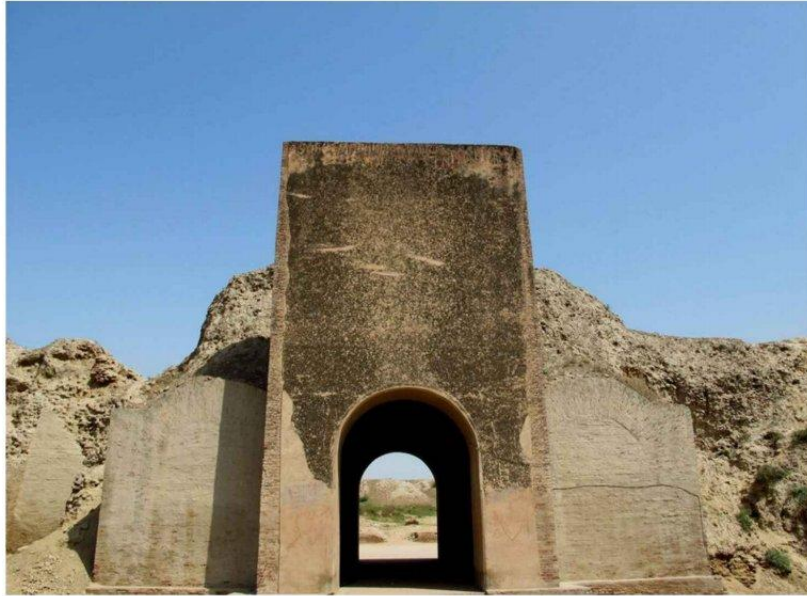
حضرت ضیاءالدین ترمذی

[30] میر سید کمال الدین کے چوتھے صاحب زادے سید جلال الدین غازی سادات نہٹور کے جدامجد ہیں جن کے منجملہ دو صاحب زادوں کے ایک صاحب زادے کا نام سید اشرف بخش تھا جن کے صاحب زادے سید احمد ہوئے اور سید احمد کے صاحب زادے سید محمود۔ سید محمود کے صاحب زادے سید حسن عسکری اور ان کے جلیل القدر صاحب زادے امیر السادات سید ضیاءالدین عرف سید ضیاء الحسنی والحسینی سلاطین افغان کے زمانے میں چار ہزاری منصب پر حکومت سنبھل میں عہدہ جلیلہ پر فائیز تھے۔ان کے صاحب زادے اور سادات نہٹور کے جدامجد اور مورث اعلی سید حسن ہوئے۔ سید ضیاءالدین بموجب حکم سرکار سنبھل، کھیر اگڑھ کے سرکشوں کی سرکوبی کے لئے مامور ہوئے اور وہیں شہید ہو کر قصبہ جھونسی ضلع الہ آباد مابین دوآبہ میں مدفون ہوئے۔ میر سید ضیاءالدین تسخیر نہٹہ گلگڑہ کے معہ افواج کثیر تشریف لے گئے۔ وہاں پر مدتوں محاربہ عظیم رہا۔انجام کار،کفّار کی کثرت، دغابازی و حیلہ سازی سے معہ گیارہ ہزار جوانان جنگی کے شربت شہادت نوش کیا۔ یہ بزرگ جیا شہید کہلاتے تھے۔ مزار خانقاہ اس بزرگ کا قصبہ جھوسی میں مابین دوآبہ واقع ہے۔ آپ کی شجاعت وغیرہ تفصیلاً تاریخ ناصری وغیرہ میں مستور ہے۔

[31] جھوسی الہ باد سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوش منظر گاؤں ہے۔ کبیر داس کے مرشد شیخ تقی یہاں کے رہنے والے تھے۔ جھوسی کی درگاہ میں متعدد گمنام مزار ہیں، عرس ہوتا ہے لیکن اہل قریہ اور مجاوروں کو کسی بزرگ کا نام ٹھیک سے معلوم نہیں۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ہم جدی شاہ شعبان کا مزار بھی غالباً یہیں ہے۔ایک ٹیلے پر قدیم کھنڈر اور قبریں یقیناً عہد مغلیہ سے قبل کی ہیں۔ درگاہ کی نشیب میں جمنا بہتی ہے۔ دریا کے کنارے پر بڑ کی قسم کا درخت بے حد تناور اور انوکھا موجود ہے کہ اس کی مہیب جڑیں ساحل سے لے کر ٹیلے کی درگاہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ مخدوم جہانیاں اس کا پودا اپنے ساتھ بھکر (پنجاب) سے لائے تھے۔ عجیب و غریب درخت ہے۔ نیشنل جیوگرافک میگزین والا دیکھ پاوے تو عش عش کرے۔

---

30 شجرہ سادات نہٹور، از حافظ عبدالرشید، ۱۹۶۳ء

31 کارجہاں دراز ہے از قرۃالعین حیدر

حضرت حسن ترمذی (نہٹوری)

[32] جب حضرت ضیاء الدین ترمذی کے بیٹے سید حسن کو باپ کی شہادت کا علم ہوٗا تو اپنا عہدہ جلیلہ اور سہ ہزاری منصب چھوڑ کر اور دنیا سے متنفر ہو کر قصبہ نہٹور میں جو گانگن ندی کے کنارے آباد ہے مقیم ہو گئے اور محلہ تیر گران میں اس مقام پر ایک مختصر سا مکان بنا کر گوشہ نشین اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔

سید حسن نہٹوری کی اولاد نرینہ میں چار فرزند ہوئے۔ سید محمد عسکری، سید علی، سید سراج الدین عرف سید راجو اور سید محمد منصور۔ ان ہی بزرگوں کے مختلف سلسلے خصوصیت سے نہٹور اور اس کے مواضعات بوڈپور اور سالار پور میں اب تک مقیم و آباد ہیں۔

جس زمانے میں سید حسن صاحب نہٹور آ کر آباد ہوئے، شاہان مغلیہ کا زمانہ تھا، نہٹور مختصر سی آبادی تھی۔ چودھری و کایستھ مغرب جنوب کی طرف تھے اور پٹھان جانب غرب اور قاضی و رسولداران وسط میں۔ سید حسن صاحب نے اس مقام پر ہی سکونت اختیار کی جہاں اس وقت سید آل علی ولد سید عبدالرزاق کا مکان ہے۔ حکومت کی طرف سے قاضی مامور تھا۔ چودھری گڑھی میں رہتے تھے، قاضی کہلاتے تھے جب کہ مسلمان بطور اوٹ پوسٹ قائم ہوئے۔ ان کی اغراض پورا کرنے کے لئے امروہا سے قاضی آتے تھے۔ بعدہٗ امروہا سے قاضی نہٹور متمکن ہو گئے۔ جب کے سید حسن صاحب تشریف لائے اس وقت قاضی چمن حیات تھے۔ اولاً سید حسن صاحب کی شادی ان کی صاحب زادی سے ہوئی اور ان کے بطن سے سید محمد عارف پیدا ہوئے جو لاولد رہے۔ سید حسن صاحب کی دوسری شادی زینب النساء ولد سید احسن کیتھلی سے ہوئی اور ان کی اولاد ہے جو بڑھی اور ہنوز جاری ہے۔ سید حسن صاحب کا ساتھ ایک تیر گر بھی آیا تھا اور وہ سید حسن صاحب کے گھر کے پاس آباد ہوٗا۔ اور اس کی اولاد میں محلہ تیر گران بنا۔ سید حسن صاحب کی اولاد میں نسب نامہ کا التزام رکھا گیا جو اب تک قائم ہے۔ نساب علحدہ ہے۔ محلہ وار نظام مع رعایا و مکیں جو اس وقت موجود ہے، اسی خاندان کا نتیجہ ہے۔ نہٹور میں علاوہ اولاد سید حسن کے دوسرے خاندان سادات آباد ہیں۔

- رسولداران
- نقوی خاص قصبہ در ملک میں مثلاً سید عبدالرزاق صاحب
- رضوی قصبہ در ترکولہ میں مثلاً محمود علی، محمد غزالی، ڈپٹی شمیم حیدر، سخاوت حسین
- مشہدی، چشتی، جیلانی تیر گراں میں مثلاً مظاہر حسین
- دانش مند بغدادی مثلاً ڈاکٹر عید علی، مہدی علی وغیرہ
- کچھ امروہا سے بھی آئے ہیں

شادی کل سیدوں میں باہمی ہوتی ہے مگر نسب نامہ کا التزام صرف خاندان سید حسن میں ہے جو شادی کے وقت مقررہ نساب پڑھتا ہے۔ کم و بیش اکثر خاندان اس کا نوٹ رکھتی ہیں۔ اولاد سید حسن شاہان اودھ، دہلی سرکار، مراد آباد میں فائیز الاحترام ہوئے۔ قصبہ و جنگل کے ابادانی، ترقی، صلح و امن قائم رکھنے میں بلا کسی تعصب و تفریق کے پیش پیش رہے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے سرکار انگلیشیہ میں ملازم رہے اور علوم مغربی حاصل کیے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سے پاکستان چلے گئے۔

32 شجرہ سادات نہٹور، از حافظ عبدالرشید، ۱۹۶۳ء

میر جلال الدین احسن (تاریخ گم گشتہ)

مستند تاریخی شواہد کے مطابق، موصوف کا تعلق گردیزی زیدی سادات سے تھا لیکن ان کے ننھیال کا سلسلہ نسب میر حسام الدین بن کمال الدین ترمذی سے مل جاتا ہے۔ یہ سلطان غیاث الدین تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ) کے فرمانده سپاہ تھے۔ اب سے کئی سال پہلے میری گریگ ویدر اَپ[33] نام کے امریکی نسّاب سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ ان صاحب کو رسول اللہ صلعم کے شجرہ نسب سے خاص دلچسپی تھی اور انہیں کچھ معلومات کی تصدیق درکار تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرا کے انہیں صحیح معلومات فراہم کر دیں۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوُا کہ میرا نسبی تعلق بھی رسول اللہ صلعم سے ملتا ہے تو انہوں نے میرے شجرہ کے بارے میں مزید استفسار کیا۔ میں نے انہیں انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل کردہ حضرت کمال الدین ترمذی اور جلال الدین احسن کے بارے میں کچھ حقائق سے آگاہ کیا۔ جناب گریگ ویدر اَپ نے میری روایات کو تسلیم کرتے ہوئے انٹرنیٹ پر ایک اور حوالے[34] کی بھی نشاندہی کی۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جلال الدین احسن صاحب نے جنوبی ہندوستان میں خود مختاری کا اعلان کر کے مابار سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس خود مختاری اس خود مختاری کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ سلطان تغلق نے جلال الدین احسن کے بڑے بھائی خطیب جمال الدین کو قتل کروا دیا تھا۔ا۔ ملاحظہ فرمایے ان کے دور کے کچھ سکّوں کی تصاویر:

گزشتہ سال میرا رابطہ جناب عبدالرافع زیدی گردیزی صاحب سے ہوُا جن کا سلسلہ نسب براہ راست میر جلال الدین احسن سے ملتا ہے۔ انہوں نے مجھے مکمل معلومات فراہم کر دیں۔ مزید تحقیق سے یہ بھی انکشاف ہوُا کہ میر حسن ترمذی نہٹوری کی دوسری زوجہ سعید النساء زینب بنت احسن الدین باقر کا تعلق بھی گردیزی زیدی سادات سے تھا۔ میر جلال الدین احسن کا ذکر ابن بطوطہ[35] نے بھی اپنے سفر نامے میں بھی کیا ہے۔

و يخبرنا بانه كتب على قبر البخارى:" هذا قبر محمد بن إسماعيل البخارى و قد صنف من الكتب" كذا و كذا ... و كذلک كتبت على قبور علماء بخارى أسماؤهم و أسماء تصانيفهم." و كنت قيدت من ذلک كثيرا- يقول ابن بطوطة- و ضاع منى فى جملة ما ضاع لمّا
رحلة ابن بطوطة، ج1، ص: 133
سلبنى كفار الهند فى البحر ..." و قد اهتم- و هو فى بلاد السند و الهند- بتقصى المنقوشات باعتبارها الرائد الذى لا يكذب أهله، فأخبرنا بأنه قرأ على مقصورة الجامع فى ملتان التى أمر السلطان غياث الدّين تغلق شاه بعملها، قرأ:" إنى قاتلت التتر تسعا و عشرين مرة فهزمتهم فحينئذ سميت بالملک الغازى " و قد اخبرنا كذلک بأنه قرأ على محراب الجامع الأعظم فى مدينة دهلى تاريخ افتتاح المدينة من أيدى الكفار سنة 584 ه- (1188 م) ...
و قد أمكنه أن يسجل ما نقشه جلال الدّين أحسن شاه على صفحتى الدينار: (سلالة طه و يس أبو الفقراء و المساكين جلال الدنيا و الدّين الواثق بتأييد الرحمن، أحسن شاه السلطان).
و مما يجرى مجرى النقوش نذكر بعض النصوص التاريخية التى حرص على تسجيلها مما يعتبر اليوم لدى المهتمين بها حججا يعتمد عليها، و نشير مثلا إلى النص التاريخى لجواب سلطان الهند على رسالة إمبراطور الصين هيّونتى(Hyunti) الذى طالب بترميم معبد بودى عتيق بقرب جبل الهيملايا فى الموقع المعروف بسمهل، حيث نجد أن العاهل الهندى يكتب إليه قائلا:" إن هذا المطلب لا يجوز فى ملة الإسلام إسعافه، و لا يباح بناء كنيسة بأرض المسلمين إلا لمن يعطى الجزية فإن رضيت بإعطائها أبحنا لک بناءه، و السلام على من اتبع الهدى" .
إلى غير هذا من الوثائق التى لم يغفلها بما فيها الكتابات باللسان الهندى على نحو ما قرأناه له و هو فى مدينة تارنا الأثرية من بلاد السند.
و قد تعلقت نفسى بمتابعة هذه المعلومات فى الرحلات التى قمت بها عبر الأنحاء التى زارها، و قد ذهبت بعيدا إلى جزر المالديف فى المحيط الهندى لأعرف جليّة الأمر حول ما نقله ابن بطوطة فى رحلته عما كان قرأه هناک" على مقصورة الجامع منقوشا فى الخشب من أن سلطان هذه الجزائر

---

33 http://community.fortunecity.ws/tattooine/spock/٦٧/gen/saadid.htm
34 https://en.wikipedia.org/wiki/Jalaluddin_Ahsan_Khan
35 رحلہ ابن بطوطہ صفحہ ۴۹

مندرجہ ذیل حوالے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے بزرگ کیتھل سے تعلق رکھتے تھے۔

جلال الدین احسن (حک: ۷۴۰-۷۳۴)

معرف

فرمانده سپاه سلطان محمد دوم غیاث‌الدین تغلق (حک:۷۵۲-۷۲۵)، نایب اِقطاع‌دار و بعدها حاکم مستقل مَعْبَر *

متن

جلال‌الدین احسن (حک: ۷۴۰-۷۳۴)، فرمانده سپاه سلطان محمد دوم غیاث‌الدین تغلق (حک:۷۵۲-۷۲۵)، نایب اِقطاع‌دار و بعدها حاکم مستقل مَعْبَر * .از زندگی او اطلاع چندانی در دست نیست. وی را سید احسن (برنی، ص۴۸۰؛ عصامی، ص۴۶۹)، سیدحسن (بداؤنی، ج۱، ص۱۶۰) و سید شریف جلال‌الدین احسن شاه (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۵، ۶۱۴) نامیده‌اند؛ اما، در سکه‌ها و کتیبه‌های باقی‌مانده از دوره او، نامش جلال‌الدین احسن ذکر شده است (ورما، ص۱۱۲؛ گورون و گونکا، ص۲۷۸؛ حسینی، ص۵۷). او در شهر کیتهل، در شمال شرقی دهلی، به دنیا آمد (رجوع کنید به بداؤنی، همانجا).جلال‌الدین احسن از فرماندهان سپاه سلطان محمد تغلق بود و در ۷۲۳ ـکه سپاه دهلی، مَدورا * (مرکز استان معبر) در جنوب شرقی هند (دکن) را فتح کرد- او نایب اقطاع‌دار این استان (ورما، ص۱۱۰-۱۱۲) یا کوتوال * شهر مدورا بود (برنی؛ عصامی، همانجاها؛ حسینی، ص۷۴). سلطان محمد تغلق، جلال‌الدین احسن را به حکومت استان معبر گمارده بود (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۵؛ ر.ماجومدار،۱۹۶۷ الف ، ص۵۹).هنگامی که دولت سلطان محمد روبه ضعف نهاد و از هر طرف شورش آغاز شد، جلال‌الدین نیز گماشتگان شاه را کشت و حکومت مستقل خود را در معبر اعلام کرد و به نام خود سکه زد. این سکه‌ها در ۷۴۰-۷۳۴ ضرب شده‌اند و بر آنها شلاله ط‌ه' ویس، ابوالفقراء و المساکین، جلال‌الدنیا و الدین، سکندرالزمان، السلطان‌الاعظم، و الحسینی حک شده است (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۶؛ برنی، ص۳۹۸-۴۰۰؛ حسینی، ص۵۹-۶۱؛ ورما، ص۱۱۰؛ گورون و گونکا، همانجا؛ ر.ماجومدار، ۱۹۶۷ ب ، ص۷۴-۷۵).هنگامی که محمدشاه خبر شورش جلال‌الدین را شنید، از دهلی با سپاهی به سوی معبر حرکت کرد، اما در نواحی تِلَنگانَه در شهر بَدْرکوت بیماری وبا در میان سپاه دهلی شایع شد و بسیاری از سربازان محمدشاه درگذشتند. به همین سبب و نیز به‌سبب شورش در دیگر شهرهای هند، سلطان محمد به دهلی بازگشت (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۸؛ برنی، همانجا). از سوی دیگر، شایعه مرگ محمد شاه باعث شد که ابراهیم خریطه‌دار (نگه‌دارنده کیسه حاوی نامه‌های سلطانی)، فرزند جلال‌الدین، در دیوان محمدشاه شورش کند؛ وی قصد داشت اموال شاهی را، که به سوی دهلی می‌بردند، به تصرف درآورد. سلطان محمد نیز او را به این جرم دو شقه کرد (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۹-۵۰۰). جلال‌الدین با هندوها جنگهای متعددی کرد (الف. ماجومدار، ص۲۳۳). ابن‌بطوطه چند سال پس از اعلامِ استقلالِ جلال‌الدین به معبر رسید و با دختر جلال‌الدین ازدواج کرد و از او صاحب فرزند شد (ابن‌بطوطه، ج۲، ص۴۹۹؛ برنی؛ حسینی، همانجاها).جلال‌الدین احسن پنج سال حکومت مستقل کرد. در ۷۳۹ یا ۷۴۰ علاءالدین اویجی، یکی از امرای جلال‌الدین، وی را کشت و جانشین او شد (حسینی، ص۶۱؛ ر.ماجومدار، ۱۹۶۷ ب ، ص۷۴-۷۵).منابع: ابن‌بطوطه، رحلةابن‌بطوطة، چاپ محمد عبدالمنعم عریان، بیروت ۱۹۸۷/۱۴۰۷؛ عبد القادر بن ملوک شاه بداؤنی، منتخب‌التواریخ ، تصحیح احمدعلی صاحب، چاپ توفیق ه. سبحانی، تهران ۱۳۷۹-۱۳۸۰ش؛ ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروزشاهی ، چاپ سیداحمدخان، کلکته ۱۸۶۲؛ مولینا عصامی، فتوح‌السلاطین ، چاپ یوشع، مدرس ۱۹۴۸؛ Stan Goron and J. P. Goenka, The coins of the Indian sultanates . New Delhi ۲۰۰۱: S. A. Q. Husaini, "The Sultanate of Ma bar", in History of medieval Deccan) ۱۲۹۵-۱۷۲۴), ed. H. K. Sherwani, vol.۱. Andhra Pradesh: The Government of Andhra Pradesh, ۱۹۷۴: A. K. Majumdar, "The succession states of the Delhi sultanate. H: South India", in The Delhi sultante . ed. R. C. Majumdar, Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan, ۱۹۶۷: R. C. Majumdar, "Ghiyas-ud-d in Tughluq (A. D. ۱۳۲۰-۲۵)". in ibid, ۱۹۶۷ a : idem, "Muhammad bin Tughluq (A. D. ۱۳۲۵-۵۱)". in ibid, ۱۹۶۷ b : B. D. Verma, Inscriptions from the Central Museum, Nagpur . in Epigraphia Indica) Arabic & Persian supplement: ۱۹۵۵-۵۸). New Delhi ۱۹۸۷.

قصہ مختصر، مابار سلطنت[36] صرف ۴۳سال تک قائم رہی اور اس میں ۸فرمانروا گزرے۔ جلال الدین احسن نے ۵سال حکومت کی لیکن ان کے امراء نے انہیں ۱۳۴۰ء میں قتل کر دیا۔

36 https://en.wikipedia.org/wiki/Madurai_Sultanate

احمد علی (سیوہارہ)

میر احمد علی انگریز فوج میں شامل تھے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں باغی قرار پائے اور انگریز ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی بندے علی نے انہیں پناہ دے کر ان کی جان بچالی لیکن اس مقصد میں کامیابی کے لئے بندے علی صاحب نے اپنے دو سالہ بیٹے عزیز حیدر کی جھوٹی قسم کھالی۔ قضائے الٰہی سے عزیز حیدر فوت ہو گئے اور بعد میں میر احمد علی کو انگریزوں نے معاف بھی کر دیا لیکن جائیداد ضبط کر لی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی شہرہ آفاق سوانح "کار جہاں دراز ہے" میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اسی تصنیف میں میر احمد علی کی آپ بیتی بھی شامل ہے۔ ملاحظہ فرمایئے چند اقتباسات:-

بڑے بھائی بندے علی[37]

۱۸۸۰ء بھی قریب الختم ہے۔ ہماری روپوشی اور جاں بخشی کا واقعہ آج افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ دل کی گلیوں میں آل تیمور بیس سال سے بھیک مانگ رہی ہے۔ شیروں کے قالین بن گئے۔

حضرت شیخ حاتم بن عنوان اصم بلخی نے فرمایا تھا اگر عبرت چاہتے ہو تو دنیا کافی ہے۔

اس برس بھائی جان بھی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ گئے۔ ایسے بھائی آج کل کہاں۔ اپنے بیٹے کی قربانی دے کر ہماری جان بچائی۔ ساری زندگی کنبہ پروری میں گزاری۔ جب تک قویٰ نے کام کیا نوجوان عزیزوں کی سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریز حکام کے نام سفارشی خطوط یا سرٹیفیکیٹ لکھا کیے۔ روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ کے کمشنران بھائی جان کو حکومت صوبہ جات شمال و مغربی کا ایک اہم ستون کہتے تھے۔ ایک بار ایک کلکٹر نے ان سے پوچھا، "ویل میر صاحب، ہمارا سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسا لائل محمڈن جنٹیلمین کا سگا بھائی اتنا بڑا مفسد اور باغی کیسے بنا۔"

ہم اب کیا بغاوت کریں گے۔ کب کے ہار مان چکے۔ تھک گئے۔

بندیلکھنڈ والوں کا اس وقت یہ حال ہے کہ نواب صاحب باندہ رانی کی حمایت میں لڑے۔ سو ریاست ان کی ضبط ہوئی۔ اب چار سو روپے ماہوار پینشن پاتے ہیں۔ علم دوست خاندان تھا۔ مرزا غالب سے عزیزداری تھی۔ منیر شکوہ آبادی ان کے ہاں ملازم تھے۔ بھائی جان مرحوم کے برادر نسبتی حافظ سید محمد موسیٰ یہیں پر ہیں۔ حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عزیز احمد ولی اللہ ہیں۔ بہت سی کرامتیں مولانا صاحب کی ان اطراف میں مشہور ہو رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان اب صرف کرامات کی امید پر زندہ ہے۔

محض ہماری بھتیجی اور بہو سعید بانو کی ننہیال میں ستر اولیاء گزرے ہیں۔ ہمارے اپنے خانوادے کے اولیاء ان کے علاوہ۔ اتنے اولیاء بہت ہیں۔ خود ہم نے علم تصوف تھوڑا بہت ایک زمانے میں حاصل کیا تھا۔ نہٹور میں بھائی جان جنت مکانی کی بیٹھک میں جو سہ دری کہلاتی ہے ہم سارے نئے اخبار منگواتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ غدر کے قبل ہم لوگ کچھ نہ جانتے تھے۔ مغرب کے علوم ظاہر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

معلوم ہوا کہ ابراہیمؑ اور نوحؑ اور آدمؑ نہ تھے۔ ازل میں صرف بندر تھا۔ ہمارے اندر ہمارے اجداد زندہ نہیں محض ایک عدد گوریلا سانس لے رہا ہے۔ نقل کفر کفر نباشد۔

علمائے دین فتوے دے چکے انگریزی تعلیم حرام ہے۔ لیکن ہم خود جو پابند شرح مسلمان اور سزا یافتہ باغی ہیں اپنے بچوں کو دیوبند روانہ کرنے کے بجائے انگریزی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہم جانتے ہیں کہ مسلمان اگر جاہل اور پسماندہ نہ ہوتے اس عبرتناک طور سے شکست نہ کھاتے۔

مگر صد افسوس کہ انحطاط کا وہی عالم ہے بلکہ پہلے سے زیادہ۔ تعویذ گنڈے جھاڑ پھونک کی گرم بازاری ہے۔ مشائخ عظام کی درگاہیں اور فقراء کی خانقاہیں عیاشی اور نشہ بازی کے اڈے بن چکی ہیں۔
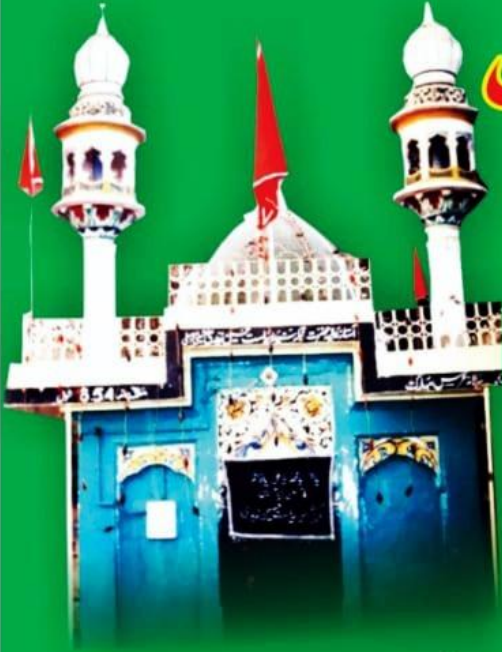
---

37 کار جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر

یا حجتہ القائم علیہ السلام ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤالدین رسولدار رحمتہ اللہ
زیدی الحُسینی مدینۃ السادات اوچ شریف
نظرِ کرم
سخی السید مروت حُسین زیدی صاحب الحُسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی رحمتہ اللہ الحسینی رسولدار
03007579114 وٹس اپ نمبر
محلہ علی پور پاکپتن شریف

غدر سے پہلے صرف ہمارے ضلع بجنور میں ۴۷ افارسی، ۱۹ عربی مدارس اور ۸۹ پاٹھ شالے تھے۔ نہٹور کا سنسکرت پاٹھ شالہ دور دور تک مشہور تھا۔ مارے مورث اعلٰی سید حسن ترمذی کا مدرسہ بند ہو چکا۔ اس کے لئے شہنشاہ ہمایوں نے جاگیر وقف کی تھی۔ جاگیر داروں کے زوال کے بعد مشہور مدارس سارے ہندوستان کے بند ہو گئے۔ ہمارا مدرسہ کب تک چلتا۔

ہمارے دونوں چھوٹے لڑکوں غلام حیدر اور حسین حیدر نے طبابت کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تیسرے بیٹے کرار حیدر سلمہ کو میڈیکل کالج لاہور بھیجا ہے۔ فرزند اکبر سید جلال الدین حیدر سلمہ جب ہم حویلی نہٹور میں حسب حکم برادر بزرگ روپوش ہوئے، اس وقت صرف بارہ برس کے تھے۔ آج ماشاءاللہ جھانسی میں ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ پولیس ہیں۔

ہم ان دنوں نور چشمی کے ہاں جھانسی میں مقیم عہد نو کا نظارہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف ایک لق ودق خاموش برآمدے میں آرام کرسی بچھالی ہے۔ اس پر بیٹھے عبرت حاصل کیا کرتے ہیں۔ چپڑاسی اخبار لا کر رکھ جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے بر قنداز لیمپ روشن کرتے ہیں۔ باہر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے۔ ایک دن اور ڈھلا۔ دنیا سے دور ہوئے۔ قبر کے اور نزدیک پہنچے۔

لیمپ کی روشنی سنہرے چوکھٹوں میں لگی سینریوں پر جھلملاتی ہے۔ دیوار پر ایک منظر کالپی کی جھیل کا ہے۔ کسی انگریز نے پینسل سے بنا کر بھائی جان مرحوم کو دیا تھا۔ جھیل کے کنارے ایک خستہ جان درویش کھڑا آسمان کو تک رہا ہے۔ عقب میں پیر روح اللہ کی شکستہ خانقاہ ہے۔

یہ سارا ملک جہانگیر نے ایک باندی کی اولاد کو بخش دیا تھا۔ پیر روح اللہ نے جھتر سال بندیلے سے خوش ہو کر اسے ایسی دعا دی کہ علاقے میں ہیرے اور پنے کی کانیں نکل آئیں۔

اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہتا۔ آج ہم نے حافظ جی سے فال کھولی۔ فرمانے لگے۔

حافظا در کنج فقر و خلوت شب ہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

ہم بالکل تنہا رہ گئے۔ ہماری بی بی سیدہ شریف النساء بھی سفر آخرت اختیار کر چکیں۔ وہ مرحومہ ہمارے ایک جد اعلٰی سید سعد اللہ کی نسل سے تھیں۔ جانے کیوں اس وقت سعد اللہ خاں کا خیال آ گیا۔ یہ ہمارے پرکھوں کی عجیب عادت ہے کبھی کبھی پھر سے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ حاضرات الخیال۔

سید سعد اللہ عامل شاہی تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن گئے تھے۔

نور چشمی بکار منصبی شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

ڈی۔ ایس۔ پی کوتوال شہر بھی ہوتا ہے۔ انگریز سرکار نے مغل عہدوں کے نام برقرار رکھ کر ان کی اصل حیثیت ادنٰی درجے کی کر دی ہے۔ داروغہ، جو ہندوستان اور تاتار سے لے کر روس و ترکیہ تلک حاکم شہر تھا اب تھانے دار ہے۔ قاضی محض نکاح پڑھانے کے لئے رہ گیا۔ صوبے دار گورنر تھا۔ اب معمولی فوجی ہے۔ صدر الصدور آج معمولی سب جج ہے۔ شہنشاہ کے محل کا خان ساماں، اب صاحب کے باورچی خانے میں کھڑا اجھال فریزی پکار رہا ہے۔ شاہی آبدار خانہ خشک ہوا۔ اب انگریزی کلب کی پینٹری آبدار خانہ کہلاتی ہے اور اس کا نگراں ہیڈ آبدار کہ شراب کی بوتلوں کا انچارج ہوتا ہے۔

مغلیہ ملبوسات چپڑاسیوں اور ہرکاروں کو پہنائے ہیں۔ وہ جو دیوان تھا، تھانے میں دیوان جی بن کر بیٹھا ہے۔ میر بخشی، میر بحری، میر بری، میر منزل، میر توزک، میر عدل سب خواب و خیال ہوئے۔ احدی جو شاہوں کے اے۔ ڈی۔ سی تھے، اب کاہل کو کہتے ہیں۔

بائی راجپوتانہ کی عصمت مآب ستی ساوتری راج کماریوں اور رانیوں کا لقب تھا۔ دور تنزل میں دربار مغلیہ کے اندر رقاصاؤں کا اثر بڑھا۔ ان کو بائی کے خطاب ملے۔ آج تمام طوائفیں بائی جی کہلا رہی ہیں۔

بمبئی کے پارسیوں نے تھیٹر کمپنیاں کھولی ہیں۔ نوجوان لڑکے زنانہ سوانگ بھر کے شہر شہر مخرب اخلاق ڈرامے دکھلاتے پھر رہے ہیں۔ مسلمان رؤساء کی عیش پرستی کا وہی حال ہے۔ اب تھیٹر کمپنیوں اور بائیوں کی سرپرستی میں پیش پیش ہیں۔ شعر و شاعری، گل و بلبل کا واویلا حسب سابق زوروں پر ہے۔

خان جہاں اور خان خاناں اور راجہ راجگان کے خطابات مرحمت کرنے والے نہ رہے۔ اب محض خان بہادری اور رائے بہادری کو نیٹو باعث فخر سمجھتا ہے اور غنیمت جانتا ہے۔

خان بہادروں کا نیا معاشرہ پیدا ہو رہا ہے۔ پل کی پل میں خود ہم لوگ جاگیرداروں کے سماج سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائینز میں آ گئے۔

ہندو مسلم فسادات کہیں کہیں شروع ہو چکے ہیں جو دورِ مغلیہ میں قطعاً مفقود تھے۔ لیکن نئی پالٹکس اور پالیسی (انگریزی کے اچھے جامع الفاظ ہیں) کے باوجود شکر ہے کہ دونوں فرقوں میں حسب سابق دوستی اور اتحاد باقی ہے۔ ہندو احباب گہری دوستی کے باوجود چھوت چھات برتتے ہیں۔ مگر اندرونی تعصب ان میں ہرگز نہیں۔ ہم بھی ان کے چھوت چھات کے دستور کا احترام کرتے ہیں۔ برا نہیں مانا جاتا۔ صدیوں سے خود ہمارے گھرانے میں یہ رواج چلا آتا ہے کہ ہندو دوستوں کی دعوت کے لئے برہمن رسویا باہر بیٹھ کر بھوجن تیار کرتا ہے۔ رواداری اور حسن اخلاق ہماری پرانی ہندوستانی تہذیب کا طرہ امتیاز ہے۔

بہت ممکن ہے آگے چل کر یہ بھی نہ رہے۔

اس وقت تک سینکڑوں مجاہدین تختہ دار پر پہنچ کر سربلندی حاصل کر چکے ہیں۔ جب یہ مجاہدین انگریز کے خلاف جہاد کے لئے گاؤں گاؤں رضاکار جمع کرتے پھرتے تھے گزر ان کی جماعت کا رامپور میں ہوًا۔ وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کی میم نے توجہ اپنے خاوند کی اس طرف دلائی کہ یہ مولوی ہماری حکومت کے خلاف اعلان جہاد کر چکے ہیں۔ اس کا سدباب لازم ہے۔ اس کے بعد ہی مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جنگ شروع کی۔

بھائی جان مرحوم کے پرانے دوست سید احمد دہلوی کے سیاسی نظریات سے ہم آج بھی متفق نہیں۔ گو ان کے اصلاحی کارناموں کے دل سے قدردان اور ان کے بے پایاں خلوص کے قائل ہیں۔ خود ہم جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہم باغیوں کی املاک ضبط ہوئیں اور میر صادق علی اور میر رستم علی ہمارے ہمسائے چاندپور کے رؤساء کا علاقہ بجرم بغاوت، سرکار نے قبضے میں لے لیا اور سید احمد خان کو پیش کیا تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ سید موصوف کے مضامین ہم غور سے پڑھتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اپنے پوتوں کو علی گڑھ بھیجیں۔

سید جلال الدین حیدر سلمہ کی شادی بھائی جان میر بندے علی مرحوم اور سیدہ مریم خاتون کی بیٹی سعید بانو سلمہا سے ہم نے کی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے ان کی اولاد بھی دیکھ لی۔ سید اعجاز حیدر، صغریٰ فاطمہ اور چھوٹا لڑکا جو حال ہی میں پیدا ہوًا ہے۔ نومولود کا نام سجاد رکھا گیا ہے۔

ان بچوں کو اور بھائی جان مرحوم کی اولاد کو خدا عمر خضر عطا فرمائے۔ بھائی جان کے دو بیٹے سید ولی حیدر اور سید اکرام حیدر بھی فی الوقت شہر للت پور میں مقیم ہیں۔

ہماری اکلوتی بیٹی ام سعید کی شادی جد بزرگ سید سعد اللہ خان عالمگیری کے نگر پوتے سید سغیر حسین سے ہو گئی۔ ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہوئے۔

میاں اکرام حیدر کے علاوہ ہماری نئی پود نے اپنے نام کے آگے ترمذی لکھنا ترک کیا۔

اللہ اللہ۔ یہ ترمذ کہاں رہ گیا؟

غدر سے پہلے جب ہم میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھے ایک بار کیتھل گئے تھے۔ شہر کرنال سے ۳۵ میل دور اشنان کا تالاب دیکھ کر سوچتے یاالٰہی کمال الدین ترمذی انہی سیڑھیوں پر آن کر بیٹھے تھے؟ بہت عجیب سالگاان کے بعد سالار مسعود غازی اور تیمور لنگ وہاں پہنچے۔ ایران کے مجوسی کیتھل میں پناہ گزیں ہوئے۔ ماورالنہر کے فقرا وہاں آن کے بسے۔ مٹی کہاں سے کہاں کھینچ لاتی ہے۔ اگر کمال الدین ترمذی کے جی میں یہ نہ سمائی ہوتی کہ ہندوستان چلیں تو ہم آج یہاں کاہے کو وکٹوریہ کی غلامی کر رہے ہوتے۔ ترمذ میں اگر چنگیز کی تباہ کاری سے بچ گئے ہوتے اس وقت زار روس کی غلامی کر رہے ہوتے۔ آج اپنے پوتوں کو لندن بھیج کر بیرسٹری کے خواب نہ دیکھتے۔ ترمذ یا بخارا سے سینٹ پیٹرز برگ روسی پڑھنے کے لئے بھیجنے کے منصوبے بناتے۔

کیونکہ جب خدانے مخالفین کا سینگ بلند کیا شہر پناہ کے دروازے زمین میں غرق ہوئے۔ فاتح نے حکم دیا مفتوح شرفاء کو قاصی علوم کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی کے دربار میں کھڑے ہو سکیں۔

والد مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ ان کی اولاد پر کیا گزرے گی۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پوتے کس قسم کی دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ والد مرحوم نے نہٹور میں جھیل کے کنارے ایک پلکھن بوئی تھی جواب چھتنار ہے۔ دوسری پلکھن کا پودا ہم نے لگایا تھا۔ دونوں "چھوٹی بڑی پلکھن" کہلاتی ہیں۔ جب یہ چھوٹی پلکھن چھتنار ہو گی تب ہم نہ ہوں گے۔

کہ یہی وقت اٹل قانون ہے۔
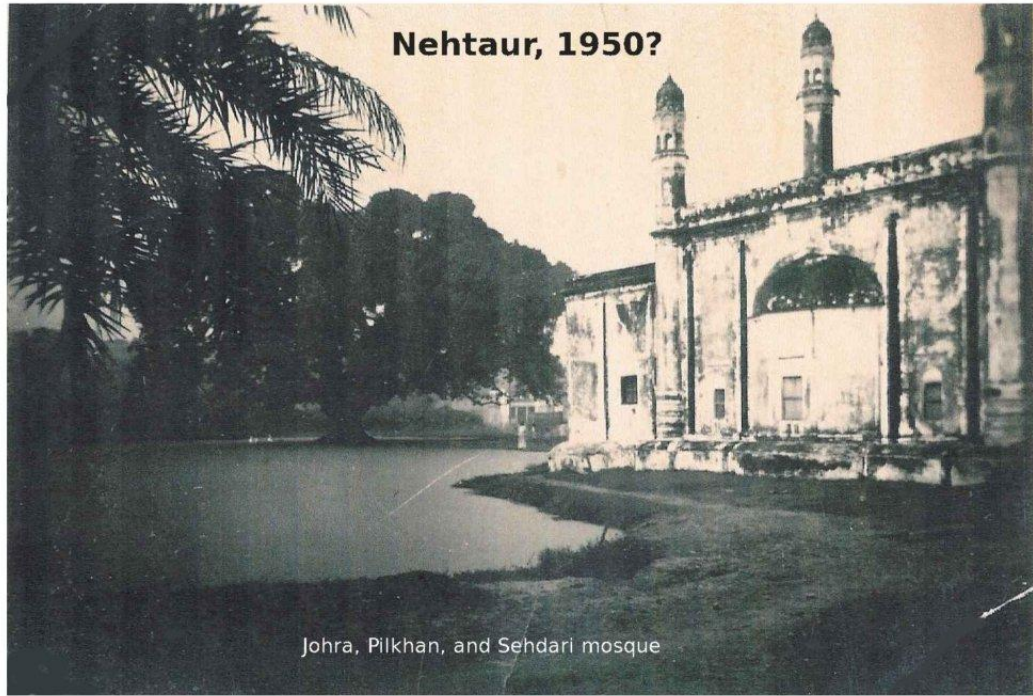
مولوی سید وقار علی صاحب

[38] نہٹور کی کل ہندو مسلم آبادی میں مولوی سید وقار علی صاحب سب سے پہلے انگریزی دان تھے۔ صرف انگریزی داں ہی نہیں ان کو عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، پشتو وغیرہ کے علاوہ لاطینی پر عبور حاصل تھا گویا ہفت زبان فاضل و منتہی تھے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج میں برطانوی سپاہیوں کی تعلیم پر معمور رہے جس کی تصدیق آپ کے برادر خورد سید اقرار علی صاحب کی خود نوشت تحریر سے ہوتی ہے۔ اس میں سید وقار علی صاحب کو فیروزپور کے مقام پر رجمنٹ ۱۰ پلٹن ۳ میں منشی کے عہدہ پر مامور بتلایا ہے۔ سید وقار علی صاحب ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ اگست ۱۸۷۲ء/ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ کو پیشاور میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ دو بیٹیاں تھیں، ام کلثوم اور ام حبیبہ۔

---

38 بشکریہ "ہمارے اسلاف"، تصنیف شکیل احمد زیدی، ۱۹۹۱ء۔
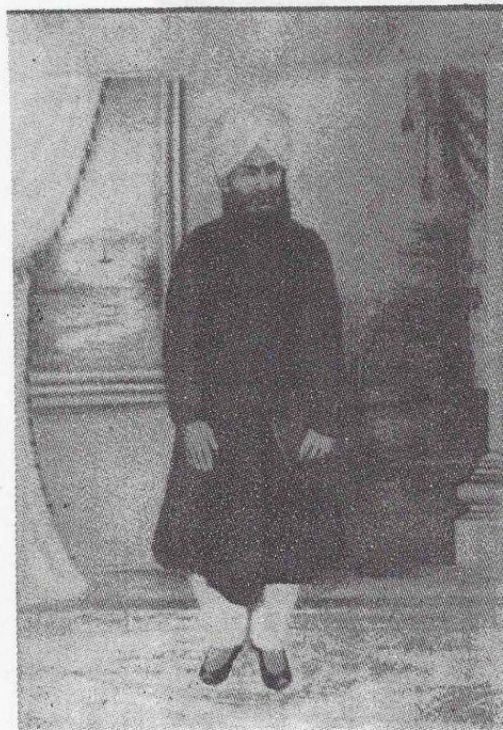
مولوی سید وقار علی ہفت زبان ابن مولوی سید تراب علی رئیس نہٹور ضلع بجنور
پیدائش : ۱۲۳۴ھ مقدسہ
وفات :- شہر پشاور ۱۸۷۲ء

سجاد حیدر یلدرم

[39] سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۰ء میں بمقام قصبہ کانڈیر ضلع جھانسی پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا' اسکے علاوہ الہ آباد یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں ایم اے او کالج میں ایل ایل بی کے کورس ہیں داخلہ لیا۔ اسی وقفے میں وہ نواب اسمعٰیل خاں تعلق دار میرٹھ کے سیکریٹری رہے اور پھر راجہ صاحب محمود آباد کے سیکریٹری بھی رہے۔ اگے چل کر وہ بغداد میں برطانوی کونسل خانے میں ترکی مترجم کی حیثیت سے مقرّر رہے۔ اسکے بعد سرکار نے سابق امیر کابل یعقوب خاں کا اسسٹینٹ پولیٹکل ایجنٹ مقرّر کرکے اپنے ملک بھیج دیا' اور ۱۹۱۲ء میں انکی شادی نذر زہرا بیگم سے ہوئی۔ یعقوب خاں کی وفات کے بعد انکی خدمات یوپی سرکار سول سروس میں منتقل کردی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی بنی تو انھیں اسکا پہلا رجسٹرار مقرّر کیا گیا۔ وہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعزازی صدر بھی تھے اور انکا شمار انجمن اردو معلٰی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت نے انھیں اسی ادارے سے بلا کر جزائر انڈیمان نکوبار میں ریونیو کمشنر بنا کر پورٹ بلئیر بھیج دیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ اٹاوہ اور غازی پور کے اضلاع میں تقرّر کئے گئے اور ۱۹۳۵ء میں طبیعت کی علالت کے سبب ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ باقی ماندہ زندگی انھوں نے تصنیف وتالیف اور علمی مشاغل میں گزاری اور ۱۹۴۳ء میں انکا انتقال ہوگیا۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔

سجاد حیدر یلدرم کے یہاں چھ بچوں کی ولادت ہوئی۔ چار بچے بچپن میں ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایک بیٹا اور بیٹی بہ قید حیات رہے۔ بیٹے کا نام مصطفٰی حیدر عرف چھبو اور بیٹی قرۃ العین حیدر عرف عینی آپا کے نام سے مشہور ومعروف ہوئیں۔ ان کی اہلیہ نذر سجاد بھی اردو کی مشہور افسانہ نگار تھیں۔

سجاد حیدر کی شہرت ان کے ترجموں اور افسانوں کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں کے ترجمہ کیے۔ ان ترجموں کی خوبی ان کی برجستگی اور فطری انداز ہے۔ سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں میں نفسیاتی تحلیل سے شغف نمایاں ہے۔ موضوعات میں تنوع نہیں ملتا۔ ان کا خیال ہے کہ صرف محبت کا تجربہ ادب کا مستقل موضوع بن سکتا ہے۔ عورت کے وجود کو ان کی تحریروں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ روشن خیالی کا عنصر ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ سجاد حیدر کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کافی مقبول ہوا۔ یہ افسانے انشائے لطیف کا نمونہ ہیں۔ دوسری تصانیف یہ ہیں: "آسیب الفت"، "گمنام خط"، "زہرا"، "کوسم سلطان"، "خارستان وگلستان"، "جلال الدین خوارزم شاہ"، "عورت کا انتقام" اور "مطلوب حسینان" وغیرہ۔

آسیب الفت میں عشق ومحبت کے عنصر کو آسیب اور مردوں کی روحوں کے تخیل سے ملایا گیا ہے۔ یہ ایک حسینہ کی سرگذشت ہے جو کہ راوی نے ہذیانی حالت میں لکھی ہے لیکن وہ اسے حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کا دوست اسے سمجھاتا ہے کہ یہ تحریر بخار کی حالت میں قلم بند کیا گیا ہے لیکن راوی کو یقین نہیں آتا۔ ملاحظہ فرمائیے ایک مختصر اقتباس:

[40] اچھا صاحب، ہم بیسویں صدی میں ہیں، بیسویں صدی والوں کی سی باتیں کریں۔ مگر یہ منطق، نہ عقل، نہ دلیل، کوئی میرے اس یقین کو میرے دل سے نہیں نکال سکتا، کہ اس بیچاری عورت نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس کی ساری سرگذشت محض میرے بخار کی تاثیر نہ تھی۔

اتنا زمانہ گزر گیا، میرے دل سے پورے صمیمیت کے ساتھ، اس مضطرب وبیقرار عورت، اس گناہگار روح کی مغفرت کے لئے دعا نکلتی ہے۔ مگر اے میری روپوش، دھندلی سی نظر آنے والی محبّہ! میں تیرے کہنے کو پورا نہیں کرتا، کسی کو تیری سرگذشت نہیں سناتا اس لئے کہ مجھ سے کہا جاتا ہے، ہم بیسویں صدی میں ہیں، اب ایسے محیر العقول افسانوں پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ اب انسان بہت فلسفی ہوگئے ہیں۔ بہت ترقی وتہذیب یافتہ ہیں۔ تاہم اے حسینہ میں تجھ پر یقین رکھتا ہوں۔ تجھے سمجھتا ہوں۔ میں تجھ پر اور تیری سرگذشت پر پورا یقین رکھتا ہوں، میں تیری مغفرت کے لئے خدا کی دراہ میں دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تو مجھ سے خوش ہوگی۔

---

39 http://www.dawn.com/news/۱۲۵۰۰۰٦

40 **آسیب الفت (ایک ترکی افسانہ)، ۱۹۳۰**

سجاد حیدر یلدرم (دائیں طرف کھڑے ہوئے) اپنے والد جلال الدین حیدر اور بھائیوں کے ساتھ۔

خلیل احمد (بانی ایک آنہ فنڈ)

[41]سید صاحب ۸ نومبر ۱۸۸۰ء کو بروز دوشنبہ نہٹور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم نہٹو میں ہی حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل، یو۔پی کے دفتر میں ملازمت اختیار کی اور ۱۹۴۲ء میں مینیجر ڈیڈلیٹر آفس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اسی دفتر میں میرے نانا ابن عباس صاحب مرحوم بھی مینیجر اسٹاک ڈپو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ جناب سید خلیل احمد مرحوم نے انجمن عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کے بانی و مربی کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۰۷ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء (اکیاون سال) کے طویل عرصہ میں عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔ برصغیر ہند میں مسلمانوں کے عہد اقتدار میں جس طرح چپہ چپہ پر اسلامی تہذیب و ثقافت کے آثار و نقوش نمایاں تھے مساجد و معابد کی بھی بڑی کثرت تھی لیکن انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد دیگر اسلامی آثار و باقیات کی طرح مساجد و عبادت گاہیں بھی دشمنوں کی یلغار اور دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ اودھ کے مشہور شہر لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار کی مساجد کی حالت بھی نہایت خستہ اور ناگفتہ بہ تھی۔ کہیں وہ گھوڑوں کا اصطبل بنی ہوئی تھیں اور کہیں آوارہ کتوں اور گدھوں کا مسکن اور کہیں وہ دیوار و در کی شکستگی و بوسیدگی کے باعث سنسان و ویران پڑی ہوئی تھیں۔ اسلام میں چونکہ مساجد کو نہ صرف خانہ خدا اور عبادت الٰہی مرکز کی حیثیت حاصل ہے بلکہ انہیں مسلمانوں کے لئے ایوان و مشاورت کا درجہ بھی حاصل ہے جہاں مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اہم دینی و معاشرتی مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ جناب خلیل احمد صاحب نے ایسی مساجد تعمیر نو اور آبادکاری کا بیڑا اٹھایا اور انہوں نے مساجد کی واگزاری، آبادکاری اور از سر نو تزین و آرائیش کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔

سید صاحب مرحوم نے مساجد کی آبادکاری اور انتظام و انصرام کے ساتھ مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی اور مذہبی تعلیم کو بھی ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی زیر نگرانی ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب بھی قائم کیا۔ مرحوم نادار و یتیم بچوں کی کفالت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے ایک علحدہ فنڈ بھی قائم کیا تھا۔ مرحوم اپنی دلکش و قدآور شخصیت کے ساتھ مشرقی و اسلامی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ اور شرافت و اخلاق کا ایسا خوبصورت امتزاج تھے جس نے ان کی شخصیت کو لکھنؤ کے عوام و خواص میں بے حد ہر دل عزیز و محبوب بنا دیا تھا۔ سید صاحب مرحوم چونکہ شعر گوئی کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اس لئے اکثر و بیشتر شعر و ادب کی محفلیں ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کے صدر دفتر میں گرم رہتی تھیں۔ سید صاحب کا کلام باقاعدہ جمع نہ ہو سکا لیکن ایک منقبت ملاحظہ فرمائیے:

صداقت میں کوئی صدیق اکبر ہو نہیں سکتا	عدالت میں عمر سے کوئی بہتر ہو نہیں سکتا
سخاوت میں کوئی عثماں کا ہم سر ہو نہیں سکتا	شجاعت میں کوئی ثانی حیدر ہو نہیں سکتا
اسی پر ہو چکا ہے اتفاق اہل بصیرت کا	کہ پیدا مثل اصحاب پیمبر ہو نہیں سکتا
حسین ابن علی کے صبر واستقلال کے صدقے	کوئی ایسا جری اللہ و اکبر ہو نہیں سکتا
شہیدان حنین و بدر جانباز پیمبر تھے	کسی میں وہ وفاداری کا جوہر ہو نہیں سکتا
دیا جو مرتبہ اللہ نے اصحاب احمد کو	وہ رتبہ پادشاہوں کو میسر ہو نہیں سکتا
خلیل آل نبی کی یاد سے آباد رکھو تم	بغیر اس کے یہ دل اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا

بشکریہ [41] ہمارے اسلاف تصنیف شکیل احمد زیدی، ۱۹۹۱ء

سید صاحب نے سرکاری ملازمت سے ۱۹۴۲ء میں سبک دوش ہونے کے بعد ایک آنہ فنڈ اور اس سے متعلق دیگر رفاہی امور میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی لیکن انہوں نے ۱۹۵۸ء میں یہ ذمہ داریاں ایک نئی انتظامیہ کمیٹی کو سونپ دیں۔ لیکن سبکدوشی کے پانچ روز بعد ہی اپنے اکلوتے بیٹے شکیل احمد کے ساتھ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ۷ سال گزارے اور ۵ نومبر ۱۹۶۵ء کو بروز جمعہ کو وفات پا گئے۔ تدفین نرائن گنج ضلع ڈھاکہ کے چاشہرا نامی قبرستان میں ہوئی۔

انجمن ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کا گیٹ

محمودہ عثمان حیدر

[42]سید سجاد حیدر یلدرم کے خاندان کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ایں ہمہ خانہ آفتاب است۔ بیگم محمودہ عثمان حیدر، سجاد حیدر یلدرم کی حقیقی چچازاد بہن تھیں اور ان کی رہائش کراچی میں میرے ہی پڑوس میں تھی اور مجھے ان سے کئی بار شرف ملاقات بھی ہو چکا ہے۔ ان کا انتقال سنہ ستر ء کی دہائی میں ہوا۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء میں بمقام نہٹور، ضلع بجنور حکیم سید غلام حیدر صاحب کے گھرانہ میں آنکھیں کھولیں۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی شادی یلدرم صاحب کے حقیقی بھانجے عثمان حیدر سے ہوئی۔ اپنے شوہر کی معیت میں ان کی ملازمت کے سلسلہ میں انہوں نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک چھے سال مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا اور اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔

بیگم محمودہ، اور ان کے شوہر سید عثمان حیدر

اس وقت ترکی میں اتاترک، عراق میں شاہ فیصل اوّل اور ایران میں رضا شاہ پہلوی بمقتضائے زمانہ وسیع اصلاحات میں مصروف تھے۔ خلوص نیت کے باوجود ایسے معاملات میں افراط و تفریط ہو ہی جاتی ہے۔ دنیائے اسلام کے لئے یہ بڑا نازک دور تھا اور اسلامی ممالک قدیم اور جدید کے دوراہے پر کھڑے عجب کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس وقت مادیت اور روحانیت، مغربیت اور مشرقیت، کفر و اسلام کم و بیش ہر شعبہ حیات میں برسرپیکار تھے۔

اردو زبان میں اچھے سفر نامے شاید بہت کم ہوں گے حالانکہ سفر نامے علمی و تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان سے ہمیں ایک خاص دور میں ایک خاص ملک کے مختلف النوع مسائل سے واقفیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب سفر نامہ لکھنے والا انتہائی خلوص سے اپنے تمام تجربات میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرے۔

مشاہدات بلاد اسلامیہ، آج سے ۸۴ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے اس میں درج ایک روح پرور واقعہ۔

بیسویں صدی میں دو جلیل القدر صحابہ کی زیارت

سلمان پاک بغداد سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں تک موٹر میں آتے جاتے ہیں۔ اب تو یہ ایک پانسو گھروں کی چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ وہ مقدس مقام ہے جہاں اکثر صحابہ گورنر کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ اس کا قدیم نام مدائن تھا اور مدتوں عراق عجم کا دار السلطنت رہ چکا تھا۔ یہ ایک آباد و بھرا پرا شہر تھا۔ اس زمانہ میں بغداد محض ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ وہی مدائن ہے جو دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد تھا اور جب دور فاروقی میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی فوجیں دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع شہر بہر شیر میں پہنچیں (جو دراصل مدائن کا دایاں حصہ تھا، تو اس وقت دجلہ کو عبور کر کے مدائن پر حملہ آور ہونے کا سوال پیدا ہوا۔ معلوم ہوا کہ یزد گرد کے حکم سے پل کو جلا دیا گیا ہے اور ایرانی محافظ کشتیوں میں سوار ہو کر مدائن کو فرار ہو گئے ہیں تاکہ دجلہ کا چوڑا چکلا پاٹ اور تیز و تند موجیں ایک قدرتی قلعہ کا کام دیں۔ مجبور اً غازیان اسلام دجلہ کے کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ مدائن کا عظیم الشان شہر مع اپنے تمام جلال و جمال ان کی نگاہوں کے سامنے تھا، جس وقت یہ وہاں پہنچے نصف شب گزر چکی تھی۔ بیچ میں دجلہ کی تیز و تند موجیں ان کی راہ روکے کھڑی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر نوشیرواں کا قلعہ سپیدرات کے چھٹتے اندھیرے میں دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ بادیہ نشینان عرب نے ایسی بلند اور عظیم الشان عمارت آج سے قبل نہ دیکھی تھی۔ مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

غرض یہ کہ کافی تردد اور سوچ بچار کے بعد حضرت سعد نے اللہ کی نصرت اور اس کی تائید پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر مع لشکر دجلہ میں اتر گئے۔ دریا کا پاٹ غازیان اسلام سے کھچا کھچ بھر گیا۔ دریا میں حد نظر تک آدمی اور گھوڑے نظر آ رہے تھے۔ پانی ان کے قدموں میں دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور پھر وہ سب پانی میں اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے جس طرح خشکی میں۔

دریا میں حضرت سعد کے ہمراہ حضرت سلمان فارسی بھی تھے۔ حضرت سعد نے کہا کہ

---

42 بشکریہ مشاہدات بلاد اسلامیہ از بیگم محمودہ عثمان حیدر مطبوعہ ۱۹۶۲ء

"خدا کی قسم! اللہ اپنے دین کو یقیناً غالب کرے گا اور اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے گا بشرطیکہ لشکر میں کوئی ایسا گناہ نہ ہو جو نیکیوں کو ضائع کر ڈالے۔"

حضرت سلمان فارسی نے جواب دیا کہ

"خدا کی قسم! مسلمانوں کے لئے زمین کی طرح دریا بھی پامال کر دیے گئے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں سلمان کی جان ہے کہ جس طرح وہ دریا میں اترے ہیں اسی طرح بخیر و عافیت دریا سے پار ہوں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔

تمام لشکر اسلام صحیح سلامت دریا سے پار ہو گیا۔ ایرانیوں نے ایسا نظارہ کب دیکھا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

دیو آمدند۔ دیو آمدند (دیو آگئے، دیو آگئے) چلاتے ہوئے فرار ہو گئے۔

اور مدائن پر مسلمانوں کو مکمل تسلط حاصل ہو گیا۔

ہاں تو مدائن کا یہی تاریخی شہر گھٹتے گھٹتے اب ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے۔ نوشیرواں عادل کے محلات کے آثار جس میں طاق کسریٰ شامل ہے دیکھنے کے لئے اکثر سیاح آتے رہتے ہیں۔ یہاں چند قہوہ خانے بھی ہیں اور ایک شاندار مقبرہ بھی ہے جس میں زیر گنبد حضرت سلمان فارسی کا مزار ہے۔ اور دو ملحق جدید طرز کے بنے ہوئے کمروں میں علٰحدہ علٰحدہ حذیفہ الیمانی اور جابر بن عبد اللہ انصاری، صحابہ رسول کے مزارات ہیں۔ دائیں طرف قدرے فاصلہ پر دریائے دجلہ عجب شان سے بہہ رہا ہے۔

مذکورہ بالا صحابہ کرام کے مزارات شاہ فیصل اوّل کے دور میں ان کی دوبارہ تدفین کے بعد بنوائے گئے ہیں۔ پہلے یہ دونوں سلمان پاک سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک غیر آباد جگہ پر دفن تھے۔ شاید ہی کبھی کبھار کوئی فاتحہ پڑھنے چلا جاتا تو چلا جاتا۔ البتہ اتنا لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ دو صحابہ کے مزار ہیں ورنہ وہاں جانے اور فاتحہ پڑھنے پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اگر کسی کا بہت جی چاہا تو اس نے سلمان پاک سے ہی فاتحہ خوانی کر دی ورنہ اللہ اللہ خیر صلّا۔ مگر ہماری خوش قسمتی سے ہمارے قیام بغداد میں ان دونوں کو پرانے مزارات سے نکال کر مقبرہ سلمان پاک میں دفن کیا گیا۔

یہ واقعہ دنیا میں صداقت اسلام کی زندہ مثال ہے جس کی تصدیق کے لئے نہ صرف ہم دو بلکہ لاکھوں آدمی جو اس وقت حاضر تھے موجود ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ حضرت حذیفہ الیمانی نے خواب میں ملک فیصل، شاہ عراق سے خواہش ظاہر کی کہ ہم دونوں کو اصل مقام سے منتقل کر کے دریائے دجلہ سے ذرا فاصلہ پر دفن کر دیا جائے کیونکہ میرے مزار میں پانی اور (حضرت) جابر بن عبد اللہ کے مزار میں نمی آنی شروع ہو گئی ہے۔

امور سلطنت میں انہماک کے باعث ملک فیصل دن کے وقت یہ خواب قطعیٔ بھول گئے۔

دوسری شب انہیں پھر ارشاد ہوا اور اگلی صبح یہ پھر بھول گئے۔

تیسری شب حضرت حذیفہ الیمانی نے عراق کے مفتی اعظم کو خواب میں اسی غرض سے ہدایت کی۔ نیز فرمایا کہ ہم دو راتوں سے بادشاہ سے برابر کہہ رہے ہیں لیکن وہ مصروفیت کی بنا پر بھول جاتا ہے۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے اپنی طرف متوجہ کراؤ۔ اس سے کہہ کر ہمیں موجودہ قبروں سے منتقل کرانے کا فوری بندوبست کراؤ۔

چنانچہ مفتی اعظم نے اگلے روز صبح ہی صبح نوری السعید پاشا کو جو اس زمانہ میں وزیر اعظم تھے فون کیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

غرض یہ کہ نوری السعید سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے تمام ماجرا نوری السعید کو سنایا۔ نوری السعید نے بادشاہ سے ان کی ملاقات کا فوری بندوبست کیا۔ خود بھی ہمراہ گئے۔ مفتی صاحب نے اپنا خواب بیان کیا تو بادشاہ نے کہا کہ بے شک میں نے دو راتوں کو متواتر انہیں خواب میں دیکھا ہے اور ہر بار انہوں نے مجھے بھی یہ حکم دیا ہے اور تو اور میں نے گذشتہ شب بھی انہیں خواب میں دیکھا ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ کس قسم کا خواب ہے لیکن چونکہ اب اس غرض سے آپ بھی تشریف لے آئے ہیں تو یہ بہت اچھا ہوُا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔

مفتی اعظم نے کہا کہ وہ صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ہم دونوں کو وہاں سے نکال کر دریا سے زیادہ فاصلہ پر کہیں دفن کر دو اب اس سے زیادہ واضح بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

شاہ فیصل نے کہا کہ میرا خیال ہے بطور احتیاط پہلے اس کی تصدیق کرا لی جائے کہ آیا دریا کا پانی اس طرف آ بھی رہا ہے یا نہیں؟

مفتی اعظم اس پر رضامند ہو گئے۔

چنانچہ عراق کے محکمہ تعمیرات عامہ کے چیف انجنیئر کو شاہی فرمان جاری ہوُا کہ مزارات سے دریا کے رخ پر ۲۰ فٹ کے فاصلہ پر بورنگ کرا کے معلوم کیا جائے کہ آیا دریا کا پانی اس طرف رِس رِس کر آرہا ہے یا نہیں اور شام تک رپورٹ پیش کر دی جائے۔ چنانچہ تمام دن جگہ جگہ کھدائی کی گئی لیکن پانی تو درکنار، کافی نیچے سے جو مٹی نکلی اس میں نمی تک نہیں تھی۔ مفتی اعظم تمام دن وہیں خود موجود رہے اور تمام کاروائی بذات خود دیکھتے رہے۔

غرض یہ کہ انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ شام کو بادشاہ کو اطلاع دے دی گئی۔

اس رات حذیفہ الیمانی نے پھر خواب میں بادشاہ کو تاکید کی کہ ہمیں ہٹاؤ۔ جلدی کرو۔ دریا کا پانی ہمارے مزارات میں جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ بادشاہ کو چونکہ رپورٹ مل ہی چکی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ محض خواب ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ اس نے اس بار پھر اس خواب کو نظرانداز کر دیا۔ اگلے روز حضرت حذیفہ الیمانی مفتی اعظم صاحب کے خواب میں تشریف لائے اور ان سے بھی وہی کہا اور سختی سے کہا کہ ہم کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہاں سے جلد از جلد منتقل کرو۔ پانی ہے کہ ہمارے مزارات میں گھستا چلا آرہا ہے۔ مفتی اعظم صاحب صبح ہی صبح ہراساں پریشاں قصر شاہی پر پہنچے اور بادشاہ کو پھر اپنے خواب سے مطلع کیا۔

بادشاہ جھلاّ اٹھا۔ آس نے کہا کہ مولانا! آپ خود ہی سوچیے کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ خود ہی وہاں تمام دن رہے اور کاروائی بھی ساری آپ کے ہی سامنے ہوتی رہی۔ ماہرین ارضیات کی رپورٹ بھی آچکی ہے کہ پانی تو درکنار وہاں نمی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اب مجھے پریشان کرنے سے اور خود پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟ جائیے، آرام کیجئیے۔ مفتی اعظم نے کہا کہ بے شک ساری کاروائی میرے سامنے ہوئی اور جو رپورٹ آئی وہ بھی میرے علم میں ہے۔ لیکن آپ کو اور مجھے متواتر حکم ہو رہا ہے اب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو آپ مزارات کھلوا دیجئیے۔

شاہ عراق نے کہا کہ بہت اچھا۔ آپ فتوٰی دے دیں۔

مفتی اعظم نے صحابہ کرام کے مزارات کھولنے کا اور انہیں وہاں سے منتقل کرنے کا وہیں بیٹھے بیٹھے فتوٰی دے دیا۔ چنانچہ یہ فتوٰی اور شاہ عراق کا فرمان اخبارات میں شائع کر دیا گیا کہ بروز عید قرباں بعد نماز ظہر ان محترم صحابہ کے مزارات کھولے جائیں گے۔

اخبارات میں فتوٰی اور فرمان کا چھپنا تھا کہ تمام دنیائے اسلام میں جوش و خروش پھیل گیا۔ رائٹر اور دیگر خبر رساں ایجنسیوں نے اس خبر کی تمام دنیا میں تشہیر کر دی۔ حج کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان مکہ معظمہ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی مزارات عید قرباں سے کچھ روز بعد کھولے جائیں تاکہ ہم بھی شرکت کر سکیں۔ ادھر ایران، ترکی، مصر، شام، لبنان، فلسطین، حجاز، بلغاریہ، شمالی افریقہ، روس، ہندوستان وغیرہ وغیرہ ممالک سے شاہ عراق کے نام تاروں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا کہ ہم جنازوں میں شرکت کرنا چاہتے ہیں براہ کرم کچھ روز کی مہلت دیجئیے۔

ایک طرف تمام دنیائے اسلام کا پیہم اصرار اور دوسری طرف خوابوں میں عجلت کی تاکید۔ سوال یہ پیدا ہوُا کہ اگر پانی مزارات میں واقعیً رِس رہا ہے تو اس رسم کو ملتوی کرنے سے مزارات کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ مفتی اعظم کے مشورہ سے دریا کے رخ پر ۱۰ فٹ کے فاصلہ پر احتیاطاً ایک طویل اور گہری خندق کھدوا کر سیمنٹ اور بجری بھروا دی گئی۔

ساتھ ہی دوسرا فرمان جاری ہوُا جس میں کہا گیا کہ مسلمانانِ عالم کی خواہش پر اب یہ رسم عید قرباں کے دس روز بعد ادا ہو گی۔ مدائن جیسا چھوٹا سا کم آباد قصبہ ان دنوں دس روز کے اندر ہی اندر آبادی اور رونق کے لحاظ سے دوسرا بغداد بن گیا۔ بستی کے تمام مہمان نواز گھر مہمانوں سے اور مسلمانوں سے کھچا کھچ بھر گئے۔ گلیاں، کوچوں اور بازاروں میں ہجوم کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میدان، صحرا دور دور تک ڈیرے خیموں سے پٹ گئے۔ جگہ جگہ سفری قہوہ خانے، ہوٹل، سرائے وغیرہ قائم ہو گئے۔ شاہی لنگر خانہ ان پر مستزاد تھا۔

اس موقع پر حکومت عراق نے خاص طور پر کسٹم اور روپیہ پیسہ کی تمام پابندیاں ختم کر دیں۔ حتیٰ کہ پاسپورٹ کی بھی قید نہ باقی رکھی۔ شاہی فرمان کے ذریعہ یہ عام اعلان کر دیا گیا تھا کہ باہر سے آنے والے اپنے متعلقہ ممالک کا محض اجازت نامہ لے آئیں۔ پھر بھی مدائن میں آنے والوں میں حجاج کی کثرت تھی جن کے پاس باقاعدہ پاسپورٹ تھے۔

ان کے علاوہ ترکی اور مصر سے اس موقع پر خاص سرکاری وفود آئے۔ نیز صحابہ کرام کو سلامی دینے کی غرض سے ان کے ساتھ اپنے اپنے ملکوں کا سرکارے بینڈ آیا۔ مصطفیٰ کمال اور جمہوریہ ترکی کی نمائیندگی ایک وزیر مختار نے کی۔ مصری وفد میں علماء اور وزرا کے علاوہ سابق شاہ فاروق والی مصر نے (واس وقت ولی عہد تھے) بطور رئیس وفد شرکت کی۔

دونوں مزارات کے گرد کافی گہری اور دور تک پہلے ہی ھدائی کرالی گئی تھی اور ایک طرف سے مزارات کی طرف ڈھلان رکھ دی گئی تھی تاکہ کرین کا پھل (جو پھاوڑے کے پھل سے مشابہ تھا) ڈھلان کی طرف آ کر مزار کے فرش کو کاٹتا ہوُا نعش ہائے مبارک کو زمین پر سے اٹھالے۔ کرین کے پھل پر اسٹریچر پہلے ہی کس دیا گیا تھا تاکہ نعش ہائے مبارک کو تابوت میں رکھنے میں سہولت رہے۔

غرض یہ کہ ان دس دنوں میں جن جن خوش نصیب لوگوں کی قسمت میں ان بزرگوں کی زیارت لکھی تھی وہ سلمان پاک پہنچ چکے تھے۔ بعد ادا ایک بار پھر اجڑ گیا۔ مدائن ایک بار پھر آباد ہو گیا۔ اس موقع پر انتہائی محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ اشخاص نے شرکت کی جن میں ہر ملک، ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر عقیدہ کے لوگ شامل تھے۔

آخر وہ دن بھی آگیا جس کی آرزو میں لوگ جوق در جوق سلمان پاک میں جمع ہو گئے تھے۔ دوشنبہ کے دن ۱۲ بجے کے بعد لاکھوں نفوس کی موجودگی میں مزارات کھولے گئے تو معلوم ہوُا کہ حضرت حذیفہ الیمانی کے مزار میں کچھ پانی آ چکا تھا اور حضرت جابر کے مزار میں نمی پیدا ہو چلی تھی حالانکہ دریائے دجلہ وہاں سے کم از کم دو فرلانگ دور تھا۔ تمام سفرائے دول، عراق کی پارلیمنٹ کے تمام ممبران اور اعلیٰ حضرت شاہ فیصل کی موجودگی میں پہلے حضرت حذیفہ الیمانی کی نعش مبارک کو کرین کے ذریعہ زمین سے اس طرح اوپر اٹھایا گیا کہ ان کی نعش کرین پر نصب کیے ہوئے اسٹریچر پر خود بخود آگئی۔ اب کرین سے اسٹریچر کو علحدہ کر کے ہز میجسٹی شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر مختار جمہوریہ ترکی اور پرنس فاروق ولی عہد مصر نے کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشے کے تابوت میں رکھ دیا۔ پھر اسی طرح حضرت جابر کی نعش مبارک کو مزار سے باہر نکالا گیا۔

نعش ہائے مبارک کا کفن حتّٰی کہ ریش ہائے مبارک کے بال تک بالکل صحیح حالت میں تھے۔ لاشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال بل کی نعشیں ہیں بلکہ گمان یہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زائد وقت نہیں گزرا۔ سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ ان دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنی پراسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔ لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے ٹھہرتی ہی نہیں تھیں۔ ٹھہر بھی کیسے سکتی تھیں؟

بڑے بڑے ڈاکٹر یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک جرمن ماہر چشم جو بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا اس تمام کاروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے جو یہ دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس منظر سے کچھ اتنا بے اختیار ہوُا کہ ابھی نعش ہائے مبارک تابوتوں میں ہی رکھی گئی تھیں کہ آگے بڑھ کر مفتی اعظم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ آپ کے مذہب اسلام کی حقانیت اور ان صحابہ کی بزرگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ لائیے مفتی اعظم ہاتھ بڑھائیے۔ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ لاالٰہ اللہ محمد الرسول اللہ۔

غرض یہ کہ نعشوں کو نکال کر شیشے کے بنے ہوئے خوبصورت تابوتوں میں رکھا گیا۔ رونمائی کی غرض سے چہروں پر سے کفن ہٹا دیا گیا۔

عراقی فوج نے باقاعدہ سلامی اتاری۔ توپیں سر ہوئیں۔ اس کے بعد مجمع نے نماز جنازہ پڑھی۔ بادشاہوں اور علماء کے کندھوں پر تابوت اٹھے۔ چند قدم کے بعد سفراء الدول نے کندھا دیا۔ پھر اعلیٰ حکام کو یہ شرف عطا ہوُا۔ اس کے بعد ہر شخص جو موجود تھا اس سعادت سے مشرف ہوُا۔ اس موقعہ پر ایک جرمن فلم ساز کمپنی نے کمال کیا۔ کمال کیا کیا بلکہ دور دراز سے آئے ہوئے مشاقانِ دیدار پر احسان کیا کہ اس نے شاہ عراق کی منظوری سے اپنے خرچ پر عین مزارات کے اوپر دو سو فٹ بلند فولاد کے چار کھمبوں پر کوئی تیس فٹ لمبا اور ۲۰ فٹ چوڑا ٹیلیوژن کا اسکرین لگا دیا۔ پھر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ کھمبوں کے چاروں طرف بھی چھت سے ملحق چار اسکرین لگا دیے گئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوُا کہ ہر کوئی اپنی جگہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر مزارات کے کھلنے
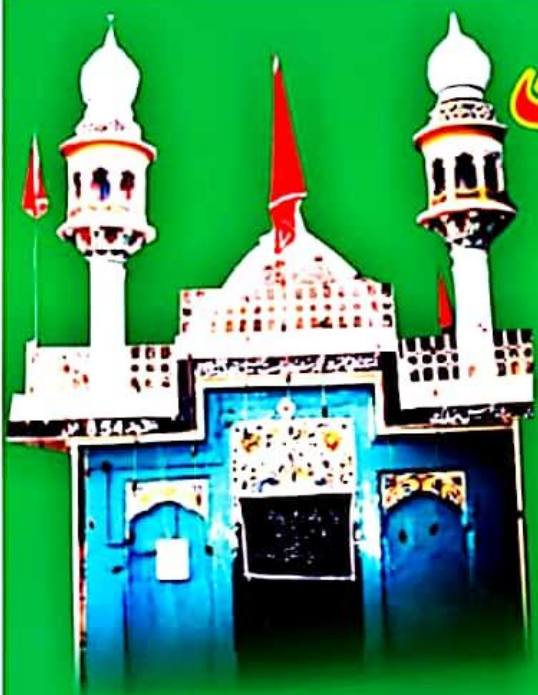
یاحجتہ القائمؑ ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤالدین رسولدار رحمتہ اللہ
زیدی الحسینی مدینۃ السادات اوچ شریف
نظرِ کرم
سخی السید مروت حُسین زیدی صاحب الحسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی الحسینی رسولدار رحمتہ اللہ
03007579114 وٹس اپ نمبر
محلہ علی پور پاکپتن شریف

کے وقت سے آخر وقت تک تمام کاروائی دیکھتا رہا۔ زیارت کے جوش میں کوئی ریل پیل نہیں ہوئی اور اس طرح ہزاروں لوگ اس ہڑبونگ میں پس کر مرنے سے بچ گئے۔ اور مردوں اور بچوں نے نہایت اطمینان سے پوری کاروائی دیکھی۔

جس وقت یہ مقدس جنازے پورے احترام کے ساتھ لے جائے ارہے تھے ہوائی جہازوں نے غوطے لگا لگا کر سلامی اتاری اور ان پر پھول برسائے۔ جب مرد کندھادے چکے تو عورتوں کو شرف دیدار سے نوازا گیا۔ عورتوں نے جگہ جگہ ان دونوں کے تابوتوں پر منوں پھولوں کی بارش کی۔ اس غرض سے راستہ میں کئی بار تابوت رکوائے گئے۔ غرض یہ کہ اس شان سے چار گھنٹے بعد جب دونوں تابوت مقبرہ سلمان پاک پر پہنچے تو اعلی فوجی حکام نے پہلے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد سفرائے دول نے پھول نچھاور کیے۔ اور پھر ان ہی اعلی ہستیوں نے جنہوں نے ان مقدس لاشوں کو سب سے پہلے کرین پر سے اتارا تھا پورے ادب واحترام سے اب نئے مزارات میں رکھا اور توپوں کی گرج، فوجی بینڈوں کی گونج اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے درمیان اسلام کے یہ دونوں زندہ شہید سپرد خاک کر دیے گئے۔

دوسرے دن بغداد کے سنیماؤں میں اس واقعہ کے فلم دکھائے گئے جس میں کندھادینے والوں میں عثمان صاحب بھی کئی بار نظر پڑے مگر میں خود کو ڈھونڈھتی ہی رہ گئی۔ عورتوں کے ہجوم میں کچھ پتہ نہ چلا۔ خیر اس سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں اپنی خوش قسمتی پر ہمیشہ نازاں رہیں گے۔

اب تک بزرگوں کی زبانی سنا ہی تھا اور کتابوں میں پڑھا ہی پڑھا تھا کہ فلاں بزرگ نے ایسا وعظ دیا کہ بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔ اور فلاں بزرگ نے منظارہ میں ایسا سماں باندھا کہ بے شمار نصرانی اور یہودی دولت ایمان سے مالامال ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ بھی ہم نے اپنی گنہ گار آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اس واقعہ کے فوری بعد بغداد میں عجب کھلبلی مچ گئی اور بے شمار یہودی اور نصرانی خاندان بلا کسی جبر کے اپنے جہل و گمراہی پر افسردہ، اپنے گناہوں پر نادم۔ ترساں ولرزاں جوق در جوق مسجدوں میں قبول اسلام کے لئے آتے تھے۔ ور مطمئن مطمئن شاداں وفرحاں واپس جاتے تھے۔

اس موقعہ پر مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔

نانی محمودہ اور نانا عثمان حیدر کراچی میں ہماری رہائیش گاہ پر اکثر آتے رہتے تھے۔ یہ دونوں بے اولاد تھے اور سنہ ستّر کی دہائی میں فوت ہو گئے۔

آرامگاہ سلمان فارسی اور منتقلی صحابہ کرام[43]

43 http://bukhari ٦٣_blogspot.ca/٠٣/٢٠١٤/blog-post_١٧_html
http://imamalicenter.se/fa/jaslighFA

عبد الله بن جابر حذيفة بن اليمان

نقل جثمان الإمامين حذيفة بن اليمان وعبد الله بن جابر الأنصاري رضي الله عنهما من ضفاف نهر دجلة إلى جانب الإمام سلمان الطاهر رضي الله عنه عام ١٩٣٢

مجيد العزيري

یہ سعادت جو ملک فیصل شاہ عراق کی قسمت میں لکھی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کے دو صحابہ کرام یعنی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاکم مدائن اور سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری نے خواب میں آ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم کو اصل مقام سے منتقل کر کے دریا سے فاصلہ پر دفن کر دیا جائے کیونکہ دریا کا پانی ہمارے مزارات کے قریب آ جاتا ہے چنانچہ عید قربان ۱۳۵۱ھ کے دس روز بعد مرحوم شاہ عراق شاہی تکریم و احتشام کے ساتھ یہ رسم ادا کی اور ان دونوں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی زیارت سے لاکھوں مسلمانوں کو شرف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ یہ دونوں جسد اطہر بالکل محفوظ تھے یہاں تک کہ کفن اور ریش مبارک کا بال بال محفوظ تھا اور آنکھوں کی چمک برقرار تھی یہ اسلام کی صداقت کا یقینی ثبوت ہے

قرۃالعین حیدر

[44]قرۃ العین حیدر کی پیدائش اونچے متوسط مسلم گھرانے میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں ہوئی۔انکے والد سے ّ" سجاّد حیدر یلدرم' جنکا شمار اردو کے مشہور کہانی نویسوں میں ہوتا ہے جو یوپی کے ایسے پڑھے لکھے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جنکے افراد دربار مغلیہ میں سہ ہزاری پنج ہزاری اور منصب دار وغیرہ رہے تھے۔انکے نگڑ دادا سیّد حسن ترندی وسط ایشیا سے ہندوستان آئے اور انکے خاندان میں علم وادب کا سرمایا وراست ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہا'انکے گھرانے کی عورتیں بھی پڑھی لکھی تھی۔یلدرم کی نانی سےّ دہ ام مریم نے تو قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجّاد کی پیدائش ۱۸۹۴ء میں صوبہ سرحد میں ہوئی۔انکے دادا معصوم علی مصنف ''انشائے معصوم'' حکومت اودھ میں ناظم اور چکلہ دار تھے اور انکے دادا خان بہادر میر قائم علی کو پنجاب کے قانون اراضی کی تشکیل و تنظیم کے لئے منتخب کیا گیا۔نذر کے والد میر نذر الباقر فوج کے محکمے سپلائی میں بہ طور ایجنٹ صوبہ سرحد میں معمور رہے۔قرۃ العین حیدر کی والدہ بھی علم وادب کی ماہر تھیں اور اردو فکشن سے کافی ذوق وشوق رکھتیں تھیں۔شادی سے قبل بنت نذر الباقر کے نام سے تہذیب نسواں 'پھول 'اور دیگر رسالوں کے لئے مضامین لکھتی تھیں 'انھوں نے اپنے زور قلم سے افسانے اور ناول بھی تخلیق کئے۔

قرۃ العین حیدر کی والدہ نے ''اختر النسائ'' کے نام سے ناول لکھا۔اس وقت انکی عمر ۱۴ سال کی تھی۔شادی کے بعد انھوں نے نذر سجّاد کے نام سے لکھنا شروع کیا۔انکے کردار میں سماجی اور مذہبی خدمت کا پر جوش جذبہ پایا جاتا ہے۔انھوں نے زمانے کے مطابق اعلی تعلیم حاصل کی اور شروع سے ہی انھیں تصنیف وتالیف کا شوق پیدا ہو گیا جسکی وجہ سے وہ سجاد حیدر سے شادی سے قبل ہی خاصی ادیبہ بن چکی تھیں۔انکی تحریریں اس دور کے جرائد میں شائع ہوتی رہتیں تھیں۔شوہر کی ملازمت کے سلسلے میں انھیں مختلف جگہ رہنے 'گھومنے پھرنے اور سےّاحت کرنے کا بھی موقع ملا۔

سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ، پورٹ بلیئر، مشرق بعید اور لاہور ہیں رہے۔قرۃ العین حیدر کی زندگی کا بیشتر حصہ انہیں مقامات پر گزرا۔قرۃ العین کا فن لازوال علمی ادبی شمع کا خزانہ ہے۔وہ علم وادب کے ساتھ ایک ملٹی ڈائمینشن ذہن کی مالک تھیں 'ذی وقار' صاحب حیثیت 'معزز زمیدار گھرانے کی بیٹی تھیں۔وہ ایک کسان کی بیٹی تھیں انکے گھرانے کے لوگ مغلیہ دربار میں اعلی منصب پر فائیز رہے۔انکے اباؤ اجداد وسط ایشیا سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔اور یہی پر سکونت اختیار کی۔جنکے دم سے علم وادب کا ایک سبز کنبہ وجود میں آیا۔علم وادب انکے خاندان کی وراست میں موجود رہا جو نسلاً بہ نسلاً چلتا رہا۔

قرۃ العین حیدر کا بچپن کا زمانہ پورٹ بلئیر میں گزرا اور انکی ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہرادون، لاہور اور لکھنؤ میں ہوئی دہرہ دون ہیں پرائیویٹ سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹر میڈیٹ ۱۹۴۱ء میں ازبلا تھوبرن کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔والد کے انتقال کے بعد بھائی کو دہلی میں ملازمت مل گئی اور سبھی لوگ دہلی آ گئے۔قرۃ العین حیدر کا داخلہ (بی۔اے ۱۹۴۵ء) میں آئی۔پی کالج دہلی یونیورسٹی میں کرا دیا گیا۔بی۔اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔اے انگریزی میں کیا۔جدید انگریزی ادب کا کورس ۱۹۵۲ء میں کیمبرج یونی ورسٹی سے کیا۔اس کے بعد آرٹ کی تعلیم گورنمنٹ اسکول آف آرٹ لکھنؤ سے حاصل کی۔صحافت کی تعلیم ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک لندن سے حاصل کی اس طرح نو عمری سے ہی ان میں گھومنے اور لمبی لمبی سیر وسیاحت کرنے کا شوق پروان چڑھنے لگا انہیں تصنیف وتخلیق کے ساتھ ساتھ مصّوری کا بے حد شوق تھا مشہور ایل ایم سین سے انھوں نے جاپانیواش تکنیک بھی سیکھی لندن میں پنچ تنتر پر بنائی ہوئی انکی الیسٹریشن کی نمائش بھی ہوئی۔اسکے علاوہ انھوں نے اپنی کتابوں کے سرورق بھی خود تیار کئے۔اور بہت سی پینٹنگ بھی بنائیں لیکن یہ صرف شوق تھا جبکہ تصنیف انکا جذبہ وجنون تھا۔

---

44 شاہین پروین، دہلی یونی ورسٹی

قرۃالعین حیدر کو عینی نام سے بھی پکارہ جاتا ہے۔ یہ اپنے عہد کی سب سے بڑی قلم کار و تخلیق کار تھیں۔ تخلیقی سفر چھ سال کی عمر میں شروع کیا تھا۔ انکی کہانی پہلی بار بچوں کے رسالے ،پھول ،لاہور میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۱۳۳ سال کی عمر میں ''ایک شام'' جیسے وہ طنزیہ اسکرپٹ کہتی تھیں۔ فرضی نام ''لالہ رخ'' کے نام سے شائع کرایا گیا۔ اس کے علاوہ دوسرا افسانہ ''یہ باتیں'' اور ''ہمایوں'' ۱۹۴۲ء میں بنت سجّاد حیدر یلدرم کے نام سے شائع ہوا۔ تیسرا افسانہ ''ارادے'' جون ۱۹۴۴ء کے ادیب میں شائع ہوا اور اس پر انہیں انعام بھی ملا۔
قرۃالعین حیدر کا بچپن نہایت ہی دلکش اور آزادانہ ماحول میں گزرا۔ ان کا خاندان قدامت پرست ہونے کے ساتھ نئے عہد سے متاثر بھی تھا۔ قرۃالعین حیدر کو ابتدا سے ہی اپنے والدین کے ساتھ مختلف جگہوں پر رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ایک جگہ خود قرۃالعین حیدر لکھتی ہیں:

''بھانت بھانت کی جگہوں پر رہنے بھانت بھانت کے لوگوں اور انسانوں سے ملے وہ جہاز کے سفر کی

بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی ،کلکتہ ، قاہرہ ،ترکی ،مستقل ادھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں''

قرۃالعین حیدر ایک خوش مزاج اور خوشحال گھرانے کی بیٹی تھیں اور ان کے والد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے رجسٹرار کے عہدے پر فائیز تھے لیکن ان کی خوشحال زندگی کو ۱۹۴۷ء تک آتے آتے زبردست دھکے لگے۔ ایک ان کے والد کی موت اور دوسرا تقسیم ہند کا المیہ۔ ان دونوں المیوں نے قرۃالعین حیدر کے ذہن ،کردار اور قلم پر زبردست اثر ڈالا۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور قرۃالعین حیدر خود بھی اس ہجرت کے قافلے میں شریک ہو کر پاکستان چلی گئیں۔ جہاں وہ مہاجرین کے قافلوں میں شریک نظر آتیں ہیں۔ ان کے درد غم میں برابر کی شریک ہو کر حقیقت کی ائینہ سامانی فراہم کرتی ہیں۔ قرۃالعین حیدر کے یہاں تقسیم ہند کا زبردست اثر نظر آتا ہے وہ تقسیم ہند کی شروع سے ہی مخالف تھیں۔ یہی سبب ہے ان کی تحریروں میں ذہنی اور جذباتی طور پر تقسیم ہند کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پاکستان میں قیام کے دوران وہ محکمہ اطلاعات و نشریات بحیثیت اسیسٹیٹ ڈائریکٹر کام کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان انٹر نیشنل ایرلائن (PIA) میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۶ء تک انفارمیشن افسر رہیں اور کچھ وقت کے لیے ''پاکستان کوارٹر'' کی قائم مقام ایڈیٹر بھی رہیں۔ مگر چند سیاسی وجوہ سے پاکستان کی سکونت کو خیر آباد کہہ آئیں۔ جواہر لال نہرو کے کہنے پر ہندوستان میں بمبئی کی سکونت اختیار کی۔ اس دوران فکشن نگار ادیبہ پر جو کچھ بیتی وہ ان کی تحریروں اور کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بمبئی میں وہ السٹریڈ ویکلی کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گئیں۔ ۸۶-۱۹۷۷ء میں ساہیتہ اکاڈمی جنرل کونسل کی اردو ایڈوائزری بورڈ کے رکن کے طور پر کام کیا جس سے دولت اور شہرت دونوں ملیں بعد ازیں قرۃالعین حیدر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر بھی کام کیا۔ انہوں نے دہلی ہی میں مکمل سکونت اختیار کی۔ آخری چند برس نوئیڈا میں گزارے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں مختلف ادبی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا جو اس طرح سے ہیں:

۱۔ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ (افسانوی مجموعہ پت جھڑ کی آواز)، بدست ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر جمہوریہ ہند ۱۹۷۶ء

۲۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، بدست محترم اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند ۱۹۶۹ء

۳۔ پرویز شاہدی کل ہند ایوارڈ ،مغربی بنگال اردو اکیڈمی ۱۹۸۱ء

٤۔ اترپردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات ۱۹۸۲ء

٥۔ غالب ایوارڈ ۱۹۸۲ء

٦۔ پدم شری ایوارڈ ۱۹۸۴ء

۷۔ غالب مودی ایوارڈ ،بدست محترمہ اندرا گاندھی ،وزیر اعظم ہند ۱۹۸۴ء

۸۔ اقبال سمان ایوارڈ (حکومت مدھیہ پردیش) ۱۹۸۸-۱۹۷۸ء

۹۔بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ،بدست چندر شیکھر،وزیر اعظم ہند ۱۹۹۰ء

۔بھائی ویر سنگھ انٹر نیشنل ایوارڈ'بدست ڈاکٹر شنکر دیال شرما'نائب صدر جمہوریہ ہند ۱۹۹۱ء

۔بھارت گورو'روٹری انٹر نیشنل(غیر معمولی ادبی خدمات)۱۹۹۱ء

۔فیلو آف ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۹۴ء

۔کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ(اردو اکادمی دہلی)،بدست پروفیسر علی محمد خسرو۔۲۰۰۰ء

ان کی ادبی خدمات پر ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا جو ان سے پیشتر اردو میں صرف فراق گور کھپوری ہی کو عطا کیا گیا تھا۔قرۃالعین حیدر نے ۱۳معروف اور معتبر ایوارڈ اور اعزازات حاصل کئے۔اپنی شخصیت اور سوانح حیات کے بارے میں مصنفہ کا خود کہنا ہے:

''آتم کتھا ظاہر ہے اپنی پیدائش سے شروع کی جاتی ہے اور چند سطور یا پیرا گراف یا صفحات خاندان کے متعلق۔میں نے اس کے لیے ۳سو سال گھنگالے اور اس سے بھی قبل ابراہیم اور باب عشتار تک۔کیونکہ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے اور میں اپنے عرب،ایرانی،تورانی اور ہندوستانی ورثے کو آپ بیتی میں شامل اور اس کا لازم حصہ سمجھتی ہوں۔''۲

قرۃالعین حیدر ہمارے عہد نو کی وہ جدید فکشن نگار تھیں جن پر اردو ادب ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔قرۃالعین حیدر اور ان جیسی تخلیقی صفات و کمالات رکھنے والی شخصیت کسی بھی زبان اور کسی بھی عہد میں صدیوں میں جنم لیتی ہے۔قرۃالعین حیدر کی وفات ۸۰سال کی عمر میں ۲۱اگست ۲۰۰۷ء(ساڑھے تین بجے شب)کیلاش ہاسپٹل نوئیڈا میں ہوئی۔جن کی تدفین بعد نماز عصر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے اس خاص قبرستان میں ہوئی جہاں علم و ادب کی دوسری عظیم شخصیات دفن ہیں۔یعنی مختار احمد انصاری'عابد حسین'صالحہ عابد حسین'غلام السیدین'غلام السقلین'پروفیسر نور الحسن'بیگم انیس قدوائی'شفیق الرحمٰن قدوائی'سجّاد ظہیر'رضیہ سجّاد ظہیر وغیرہ سپرد خاک ہیں۔

قرۃالعین حیدر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز تاریخ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عالمی ادب پر پھیل گئیں۔ان کی شاہکار تحریروں میں میرے بھی صنم خانے'سفینۂ غم دل' آگ کا دریا،آخر شب کے ہمسفر،گردش رنگ و چمن،کار جہاں دراز ہے،چاندنی بیگم ناول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔جلا وطن،آئینہ فروش شہر کوراں،روشنی کی رفتار سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات،فقیروں کی پہاڑی،آوارہ گرد،فوٹو گرافر وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو ان کی تاریخ و ادب سے دلچسپی کی گواہی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انھوں نے مشرقی پاکستان(بنگال)کے امیر طبقے کے ہاتھوں غریب محنت کشوں کے استحصال کے خلاف چائے کے باغ جیسی دردناک کہانی قارئین کے سامنے پیش کی اور اسی دور میں انھوں نے اگلے''جنم موہے بٹیانہ کیجو''جیسی عہد وآفرین کہانی لکھ کر عورت ذات کی حالت و کیفیت'زبوں حالی اور معاشرے کے ایک المیہ کو اس انداز میں تحریر کیا ہے کہ یہ تحریر ادب عالیہ کا لافانی کارنامہ بن گئی۔

بہر حال ان کی بے پناہ ادبی خدمات کے اعتراف میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شیخ الجامعہ پروفیسر مشیر الحسن نے کچھ اقدامات کئے تھے جن کو عملی جامہ کچھ اس طرح پہنایا گیا ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں پہنچنے کے لیے پہلا دروازہ ہے اسے باب''قرۃالعین حیدر''کے نام سے زندہ و تابندہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی مستقبل یادگار کے لیے ایک میوزیم اور لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے۔علاوہ ازیں قرۃالعین حیدر کے نام سے ایک چیئر کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔تاکہ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف سے آنے والی نوجوان نسل کو بھی قدر شناس کیا جاسکے۔وہ نہ صرف افسانہ و ناول نگار تھیں بلکہ کامیاب مدیر و مترجم بھی تھیں اس کے علاوہ انہوں نے ناولٹ بھی تحریر کیے۔

قرۃالعین حیدر کی تخلیقات میں افسانے،ناول،ناولٹ،رپورتاژ،تراجم اور کہانیاں شامل ہیں۔ان کے چار افسانوی مجموعے ہیں جن میں پہلا افسانوی مجموعہ''ستاروں سے آگے''ہے۔جس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔یہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔دوسرا''شیشے کے گھر''۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جس میں بارہ افسانے شامل ہیں۔تیسرا افسانوی مجموعہ''پت جھڑ کی آواز''۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا جس میں آٹھ افسانے شامل ہیں۔چوتھا مجموعہ''روشنی کی رفتار''ہے جو کہ ۱۹۸۲ء شائع ہوا جس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔اس کے علاوہ ۱۱۲ایسے افسانے ہیں جو کسی کلیات یا مجموعہ میں ابھی شامل نہیں کئے گئے۔

محمود ہاشمی اپنے مضمون''قرۃالعین حیدر:جدید افسانے کا نقطہ آغاز''میں حیدر کی افسانہ نگاری کے آغاز سے متعلق کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

""قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا آغاز اس عہد میں ہوا جب بیسویں صدی کی دنیا کئی ذہنی اور سیاسی انقلابات سے گزر چکی تھی۔ پرانی بنیادوں پر قائم حقیقتیں لڑ کھڑا رہی تھیں، تخلیقی ذہن نئے سوالات اور نئی حسیت سے روشناس ہو رہا تھا۔ ماضی ایک ویرانے کا لینڈ اسکیپ بن چکا تھا۔ جس میں سنسان ہوائیں اور عہد گذشتہ کی عظمتوں کے کھنڈرات موجود تھے...دو عظیم جنگوں، ملکی بین الاقوامی سیاست نے انسانی زندگی کی تمام بنیادیں منتشر کر دی تھیں۔ انسان کا انفرادی وجود ریزہ ریزہ ہو کر عدم کے اس افق سے قریب ہوتا جا رہا تھا جہاں موت کا سناٹا تھا—یا زندگی سے متعلق انتہائی اضطراب زدہ سوالات ""۔

محمود ہاشمی کے قول سے اتفاق کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ اضطراب زدہ سوالات کی روشنی میں بیسویں صدی کے ادبی منظر نامے کا اگر منظر غائر مطالعہ کیا جائے تو قرۃ العین حیدر کا زمانہ ادبی لحاظ سے اس زرّیں دور کا آغاز کہا جا سکتا ہے جہاں ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی تو دوسری تہذیب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ تانا شاہی کے سفاک اور خون آلودہ پنجوں سے نجات حاصل کرنے کی تگ و دو اپنے عروج پر تھی۔ اس پُر آشوب ماحول میں قرۃ العین حیدر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ ان کا تخلیقی سفر کم و بیش ستر سالوں پر محیط ہے۔ ان ستر سالوں ہیں انہوں نے اپنی تخلیقات میں تاریخی حقائق، انسانی نفسیات، معاشرتی ارتباط کے عوامی اور انسانی رشتوں کی قدر، فطرت کائنات، وقت کا جبر اور موت کے فلسفے پر پوری زندگی زور دیا۔ وہ نہ صرف فنکار تھیں بلکہ انسانیت کی عظیم فنکار تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے افسانوں میں زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے بلکہ پورے فکشن میں اس کی عکاسی کی ہے اور آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح منزل دریافت کرانے کی کوشش کی تھیں۔ یہ اپنے پورے فکشن میں ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتیں ہیں۔ یہی سبب ہے قرۃ العین حیدر کا ناول ""آگ کا دریا"" اردو ادب کا ایک شاہکار ناول ہے۔ جو قدیم عہد کا سراغ لگانے سے لے کر جدید عہد تک کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے یہ ناول ڈھائی ہزار سال پرانی ہندوستان کی تاریخ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ قدیم عہد کی طرح آج کا انسان بھی وقت کی طاقت کے ہاتھوں بے بس و مجبور نظر آتا ہے۔

اسمیں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ قرۃ العین حیدر اردو ادب میں اس گوہر بار شخصیت کا نام ہے جنہوں نے ہندوستانی ادب کو کئی قیمتی سرمائے سے سرفراز کیا اور سماج کو نئی فکر اور نئے احساسات عطا کئے۔

ان کا پہلا افسانہ ""سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات اور دوسرا"" روشنی کی رفتار"" یہ طویل افسانے ہونے کے ساتھ ساتھ کئی زمانوں پر محیط ہیں یہی سبب ہے کہ قرۃ العین حیدر کو فکشن نگاری میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔ انھوں نے کچھ رپورتاژ بھی تحریر کئے جو کہ اس طرح سے ہیں۔

۱۔ لندن لیٹر (""شیشے کے گھر""میں شائع ہوا) ۱۹۵۴ء

۲۔ ستمبر کا چاند، در چمن ہر ورقی دفتر حالو گزشت (نقوش لاہور) جون ۱۹۵۸ء

۳۔ چھٹے اسیر تو بدلہ ہوا زمانہ تھا۔ (نقوش لاہور) اپریل تا جون ۱۹۶۶ء

۴۔ کوہ دماند (آج کل، نئی دہلی)————

۵۔ گلگشت (گفتگو، بمبئی)————

۶۔ خضر سوچتا ہے یک بابی تمثیل: جہاں دیگر (آج کل، اردو)————

اسکے علاوہ انھوں نے کچھ تراجم بھی کئے۔

۱۔ ہمیں چراغ ہمیں پروانے (از ہنری جمیس) ۲۔ ماں کی کھیتی (از میخائل اعتمادوف)

۲۔ آپس کے گیت (از واسل بائی کوف)

۳۔ آدمی کا مقدر (از میخائل شولوخوف)

۴۔ کلیسا میں قتل (از ٹی ایس ایلیٹ)

۵۔ تلاش (از ٹرومین کاپوٹ)

۶۔ یووو کیہ

قرۃ العین حیدر نے بچوں کے ادب سے متعلق بھی کام کیا جنکا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ انمیں تراجم شامل ہیں۔

اسکے علاوہ اپنی کتابوں کے اردو سے انگریزی میں ترجمے کئے جو کہ اسطرح ہیں:

۱۔ آگ کا دریا (The river of fire)

۲۔ آخر شب کے ہم سفر (Fier files in the mist) اسٹرلنگ ۱۹۹۴ء

۳۔ پت جھڑ کی آواز (The sound of falling leaves)———-

۴۔ جلاوطن (افسانہ) (The Exiles) پاکستان———-

۵۔ اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو (A women's life) چیتنا پبلی کیشن ۱۹۷۹ء

۶۔ چائے کے باغ———-(Tea garden of sylhat)

اسکے علاوہ بہت سے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو امپرنٹ اور السٹرویکلی میں شائع ہوئے۔ قرۃ العین حیدر کی مرتب کتابیں جو پریس میں ہیں۔ گزشتہ برسوں کی برف نذر سجّاد حیدر کا روز نامچہ 'ایام گزشتہ (والدہ) اور دوسرا سے' داافضل علی (قرۃ العین حیدر کے خالو)۔ اسکے علاوہ انکی کتابوں کے ترجمہ جو دوسروں نے کئے اور جو کتابیں دوسروں نے مرتب کی اختصار نویسی کے سبب انکا ذکر نہیں کیا جارہا۔

ان کے شاہکار افسانوں، ناولوں اور ناولٹوں کا بنیادی موضوع وقت کا جبر، انسان کی بے چارگی، تنہائی ازلی وابدی جلاوطنی اور شدید احساس ناکامی ہے اس کے علاوہ عورت کا مقدر بھی ہے۔ قرۃ العین حیدر ایسی آفاقی مصنفہ ہیں کہ جنہوں نے کسی بھی ازم میں مقید ہو کر نہیں لکھا۔ وہ حال کو ماضی کا آئینہ دکھا کر ماضی کی بازیافت پر زور دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تاکہ مستقبل کی صحیح پیشن گوئی کی جاسکے۔ انہیں تاریخ سے دلچسپی تھی یہی سبب ہے انہوں نے جو کچھ بھی اپنے علم سے صفحہ قرطاس پر تحریر کیا اس میں جنگ وجدل دو عالمی جنگوں، نوآبادیات جاگیر دار طبقہ کا عروج و زوال، ہندوپاک کی تقسیم، مشرقی ہند کی تحریکات، تاریخ وافسانہ روحانیت ومادیت کو اس طرح سمو کر رکھا ہے کہ ان کی مثال ابھی تک کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ جن اہل نظر نے ان کا موازنہ کیا کہتے ہیں بعض جگہ اپنے مغربی پیش رو جیمس جوائس اور ورجینا وولف سے بھی آگے نکل گئی ہیں۔ اردو زبان وادب کی نشو نما اور ارتقائی دور ہیں آغاز سے اب تک قرۃ العین جیسی کوئی قلم کار پیدا نہیں ہوئی۔ جنکی تخلیق سے اتنا وسیع سرمایا اردو ادب کو حاصل ہوا انکا تخلیقی ادب روایت سے آگے جا کر ملک اور غیر ممالک میں بھی قدر ومنزلت کی نگاہ دیکھا جاتا ہے اور آگے بھی دیکھا جاتا رہے گا۔

سید اشتیاق حسین زیدی شہید

برّصغیر پاک وہند میں مذہب کے نام پر سیاست ایک غیر فطری عمل ہے جسکی وجہ سے پورا خطہ غیر یقینی کا شکار ہے۔

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ محمود غزنوی کے اس لشکر میں جو سومنات پر حملہ آور ہوا کثیر تعداد میں غیر مسلم شامل تھے۔ مغل بادشاہ اکبر کے نورتنوں میں ہندوؤں کو نمائندگی دی گئی تھی۔ بعد میں آنے والے بادشاہوں نے اپنے پیشروؤں کی اس پالیسی کو جاری رکھا۔ راجہ رنجیت سنگھ کابل سے ملتان تک بشمول کشمیر حکمران تھا۔ اس کی فوج کی کمان مسلمان جرنیل کے پاس تھی۔ رنجیت سنگھ کی کابینہ میں کئی مسلمان وزیر تھے۔

Ishtiaq Hussain Zaidi

پھر اچانک ایک دور ایسا آیا کہ مل جل کر رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ جب فرنگی اقتدار کا سورج اس کی نوآبادیات میں غروب ہونے لگا تو مالی مشکلات پیدا ہوئیں اور تاج برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ نوآبادی ہندوستان کے باشندوں کا آزادی کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے۔ دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے۔ فیصلہ ہوا کہ ہندوستان کو تاج برطانیہ کی شرائط پر آزادی دیدی جائے۔ اس مشروط آزادی نے تباہی مچائی۔ غیر منقسم ہندوستان کے نام نہاد لیڈر اس ذمہ داری کو نبھانے کے اہل نہیں تھے۔ انہوں نے اس کے لئے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں اور سماجی و اصلاحی کارکنوں نے نوّے سال تک ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی۔ جب تاج برطانیہ کے نمائندوں نے دیس ہندوستان کے نمائندہ نیتاؤں اور رہنماؤں کو اعتماد میں لیا اور آزادی کی نوید سنائی تو ان مورکھوں کے پاس کوئی آئین تھا اور نہ انتقالِ آبادی کو ریگولیٹ کرنے کا کوئی منصوبہ تھا۔

ہندوستان کی دیسی آبادی نے کبھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا۔ ایک غدر بپا کیا تھا۔ سواس میں بھی چھوٹی سی انگلستانی فوج کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ بعد میں اس کا نام ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی رکھا۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

سر سیّد احمد خان نے اپنی تصنیف اسبابِ بغاوتِ ہند میں بغاوت کے جو اسباب بیان کئے تھے ان کے بارے میں ایک انگریز مسٹر لکی کی رائے ریکارڈ پر موجود ہے۔ مسٹر لکی نے لکھا تھا "اِس دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت ہے"۔ اس بغاوت کو ان لوگوں نے ناکام بنایا جو نوے برس جنگ آزادی لڑ کر اپنی نسلوں کے لئے جاگیریں اور منصب حاصل کر رہے تھے۔ ہندوستان کو آزادی دینے سے پہلے انگلستان نے شہر شہر اپنے جانشین بٹھادئے تھے۔ گویا آزادی ملنے کے بعد ان کٹھ پتلیوں نے حکومت برطانیہ کی نمائندگی کی۔ اسی لئے فیض صاحب نے اعلانِ آزادی کو شب گزیدہ سحر کہا تھا۔

آخر کار ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ اچھا ہوا۔ لیکن بہت خون خرابہ ہوا۔ اتنی کم مدت میں اتنی زیادہ ہلاکتیں میرے علم میں نہیں ہیں۔ بس اسی تسلسل میں دہرہ دون بھی متاثّر ہوا۔ دہرہ دون رؤساء، راجاؤں اور نوابوں کا شہر تھا۔ پندرہ سولہ میل چڑھائی کے بعد مسوری تھا۔ جہاں ہندوستان کے بہترین رہائشی تعلیمی ادارے تھے۔ ان میں ہندوستان کے رؤساء کے بچّے تعلیم پاتے فرنگی کلچر پریکٹس کرتے اور ہندوستانی سوچ سے فارغ ہوجاتے۔

سید اشتیاق حسین زیدی خوب تعلیم یافتہ اور زندگی کے بارے میں مثبت سوچ رکھنے والے انسان تھے۔ حلقۂ احباب میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہندو، مسلم، انگریز اور نیپالی جو تحفے میں خنجر دیا کرتے تھے۔ لبرل روّیوں کے سچے انسان تھے۔ اپنے سب بچوں سے پیار کرتے تھے۔ خُشکا نہیں تھے۔ خوب ہنستے تھے۔ میں ان کا دوست تھا۔ احباب جمع ہوتے تو کتابوں اور سیاست پر باتیں ہوتیں۔ ایسی ہی کسی مجلس میں ان کا ایک جملہ اب بھی مجھے یاد آتا ہے۔

"آپ ہندوستان کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ ضرور کیجئے۔ ایک نہیں ایک درجن نئے ملک بنائیں۔ لیکن امن کے لئے اس کا وہ تشخّص برقرار رکھئے جس کے لئے مغلوں نے بہت دانشمندی سے کام کیا"۔ ان کی اس سوچ نے گمنام حلقوں میں ان کے جانی دشمن پیدا کئے۔ نیا نگر، وائسرائے روڈ کے دوسرے مسلمان مکینوں نے اشتیاق حسین زیدی کو احتیاط کا مشورہ دیا۔ سب کہتے تھے یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ اشتیاق حسین زیدی کہتے کہ جو کرنا ہے ابھی کرو۔ وقت نکل گیا تو پچھتاؤ گے۔ بچے اردو نہیں پڑھ سکیں گے۔

۱۶۔ ستمبر ۱۹۴۷ کو مسلمانوں نے ایک پرامن جلوس نکالا۔ معمول کے مطابق اشتیاق حسین زیدی اپنے جمے جمائے آبائی کاروبار کی نگرانی کے لئے دھامانوالہ بازار گئے۔ میں اور مصداق ان کے ساتھ گئے تھے۔ میں واپس آگیا۔ رونق نہیں تھی۔ جلوس پر گولی چلی۔ گورکھا رجمنٹ کو حکم دیا گیا تھا کہ دیکھتے ہی گولی ماری جائے۔ سب لوگ عمارت میں بند ہو گئے۔ باہر سے کسی نے نام لے کر پکارا۔ "باہر آ جاؤ، ہم تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔"

اشتیاق حسین زیدی باہر آ گئے باہر گورکھا فوجی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔۔ سڑک پار کی منزلہ عمارت میں ایک ہندو ڈینٹل سرجن کا کلینک تھا۔ اس کا تعصب مشہور تھا۔ ڈاکٹر گیلری پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اشتیاق حسین زیدی کو دیکھا اور گورکھا سپاھی کو للکارا "کرفیو کی خلاف ورزی ہو رہی ہے" سپاہی نے اشتیاق حسین زیدی کے سینے کا نشانہ لیا اور تین فائر کئے۔ جب تک اشتیاق حسین کا سانس چلتا رہا اللہ اکبر کا نعرہ کرفیو کے سناٹّے میں گونجتا رہا۔ اس روز غالبا "۷۳ شہادتیں ہوئیں تھیں۔ اشتیاق حسین کی باڈی گھر نہیں لائی گئ۔ سب کو باہر ہی باہر دفن کیا گیا۔ شہید کو غسل اور کفن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں شہید کی قبر کا علم نہیں ہے۔

بس اس کے بعد سرحد کے دونوں طرف برداشت کا کلچر واپس نہیں آیا۔ وہ بھی شہیدوں کے ساتھ دفن ہو گیا۔

یا حجتہ القائم علیہ السلام ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤالدین رسولدار رحمتہ اللہ
زیدی الحُسینی مدینہ السادات اوچ شریف
نظرِ کرم
سخی السید مروت حُسین زیدی صاحب الحُسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
اس کتاب کی PDF کاپی برائے ایصالِ ثواب بزرگان
خاندان سادات زیدی رسولداران نہٹور تیار کی گئی ہے
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی رحمتہ اللہ الحسینی رسولدار
محلہ علی پور پاکپتن شریف
وٹس اپ نمبر 03007579114
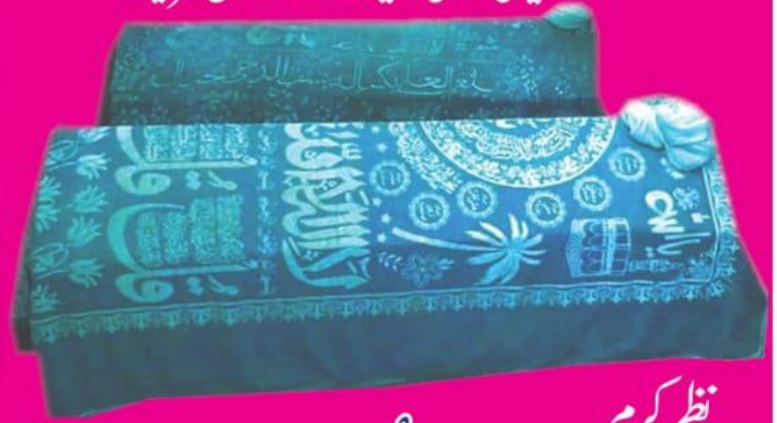
واسطی سادات نگینہ

زیدی سادات کی ایک اور شاخ

—

اس حصے میں زیدی سادات کی ایک اور شاخ، یعنی الواسطی کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد محلہ سادات نگینہ میں آباد تھے۔

واسطی سادات نگینہ

ساداتِ نہٹور کے علاوہ سادات نگینہ میں بھی اپنے آباء واجداد کی جستجو کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ایک نودریافت سلسلہ نسب (مرتبہ جناب ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب) کے چند صفحات کے مطابق، ان کے مورث اعلی کا نام ابوالفرح واسطی بن سید داؤد الحسینی تھا۔ یہ عراق کے ایک مقام واسط سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ان کے جد امجد تھے حضرت عیسی بن زید، موتم الاشبال۔ یہ بزرگ اپنے مرشد سیدنا معین الدین سنجری اجمیری کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ حضرت معین الدین سنجری اجمیری کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے تھا جس کے بانی حضرت ابواسحاق شامیؒ تھے۔

[45]حضرت معین الدین سنجری اجمیری اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے اور علم شریعت کے حصول کے بعد انہوں نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس سفر کے دوران انہیں خواب میں رسالت مآبؐ سے بشارت ملی:

"اے معین الدین تو میرے دین کا معین ہے میں نے تجھے ہندوستان کی ولایت عطا کی وہاں کفر کی ظلمت پھیلی ہوئی ہے تو اجمیر جا تیرے وجود سے کفر کا اندھیرا دور ہو گا اور اسلام کا نور ہر سو پھیلے گا۔" (سیر الاقطاب ص ۱۲۴)

نیند سے بیدار ہونے کے بعد آپ نے چالیس اولیا کے ہمراہ ہندوستان (اجمیر) کا قصد کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کس سن میں اجمیر تشریف لائے اس سلسلے میں آپ کے تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ویسے زیادہ تر اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ۵۸۷ھ /۱۱۹۱ء کو اجمیر شہر پہنچے۔ مذکورہ بالا شجرہ سادات نگینہ کے مطابق یہ سال ۵۸۳ھ تھا اور سلطان شہاب الدین غوری کا دور تھا۔ جناب ابوالفرح واسطی نے چھاترودٌ نامی مقام پر قیام کیا۔ یہ مقام ضلع مظفر نگر میں واقع ہے۔ سادات نگینہ کا نسب نجم الدین بن ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے اور دراصل یہ سادات بارہ کی ایک شاخ ہیں۔ جناب حسن مجتبٰی کے تعاون سے سادات نگینہ کا ایک اور نسب نامہ بھی دریافت ہوا ہے۔ اس نسب نامہ میں بھی سادات نگینہ اور سادات بارہہ کو ایک ہی سلسلہ تسلیم کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر اپنی سوانح "کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل، صفحہ ۵۴)" میں رقم طراز ہیں کہ حضرت حسن ترمذی کہ فرزند اکبر سید علی (گھوڑا بخش) کی شادی سیدہ شوکت النساء دختر سید محمد باقر عامل شاہی سے ہوئی، ان کے بیٹے سید محمد تقی نے سید اسد اللہ زیدی کی لڑکی فضیلت النساء سے عقد کیا۔ سید اسد اللہ زیدی بھی سرکار سنبھل میں عہدہ دار اور امروہے میں تعینیات تھے۔ سادات بارہہ سے تعلق رکھتے تھے۔

نیز بہ جناب ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب اپنے مرتب کردہ شجرہ واسطی سادات نگینہ کے صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے پرداداسید ارشد علی کی شادی نہٹور میں مسماۃ عمرۃ النساء دختر سید محرم علی سے ہوئی۔ جناب ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل کی آل اولاد لاہور میں آباد ہے۔ خود ان کی شادی بھی سادات نہٹور میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ عفیفۃ النساء مرحومہ بنت اظہار الحسن میرے نانا ابن عباس کے بڑے بھائی شبّر حسن کی بیوہ تھیں۔ نانے شبّر حسن کا انتقال میری والدہ تعظیم فاطمہ کی پیدائیش سے قبل ہی ہو گیا تھا لیکن میری والدہ صاحبہ کو مرحوم ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل کے صاحبزادے جلال الدین اکبر مرحوم سے بھی لاہور میں ملاقات کا اتفاق ہو چکا ہے۔ جلال الدین اکبر مرحوم کا عقد محترمہ زاہدہ بتول رضوی سے ہوا تھا جن کا تعلق رضوی سادات ترکولہ سے تھا۔ محترمہ زاہدہ بتول رضوی کی والدہ منیر فاطمہ مرحومہ میرے نانا ابن عباس اور نانی تشبیہ فاطمہ کی عم زاد تھیں۔

اس کے علاوہ واسطی سادات نگینہ کی سادات سیوہارہ سے بھی قرابت داری تھی۔ چنانچہ میرے کرم فرما میثاق حسین زیدی کی پھوپھی محترمہ سیدہ رئیسہ کا عقد بھی مرحوم سید اسرار علی زیدی سے ہوا تھا جن کا تعلق واسطی زیدی سادات نگینہ سے تھا۔ ان کی آل و اولاد پاکستان کے علاوہ کینیڈا میں بھی مقیم ہے۔

یہ تو تھیں چند نودریافت شدہ قرابت داریاں لیکن ان کے علاوہ بھی سادات نہٹور و سادات سیوہارہ یا سادات نگینہ وغیرہ سے بھی رشتے داریاں قائم ہیں۔

ان سب حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے واسطی سادات نگینہ کے شجرہ نسب کو سلسلہ سادات نہٹور میں ضم کر کے نسب نامہ سادات بجنور ترتیب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ واسطی سادات نگینہ کا شجرہ نسب بھی میرے کرم فرما محترم خورشید عالم زیدی کی دریافت ہے۔ اس کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:-

- جناب ابو عبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب کے مرتب شدہ نسب نامہ میں کچھ اشکال ہے۔ وہ خود بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ، "مدت سے جب کبھی اپنے نسب نامے کو دیکھتا تھا تو یہ خیال آتا تھا کہ اگر کل سادات زیدی الواسطی کا نسب نامہ ایک جگہ ہو جاوے تو بہت ہی اچھا ہو مگر یہ ہو نہ سکا۔" مندرجہ بالا تاریخی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سادات نگینہ اور سادات بارہہ کے مورث ابوالفرح واسطی، حضرت عیسی بن زید، موتم الاشبال کی نسل سے تھے۔

---

45 http://www.ahlesunnat.net/media-library/downloads/regularupdates/khwajamueenuddin.htm

- اس پیشکش میں اصلاح کی گنجائش ہے کیونکہ حضرت کمال الدین ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب غلط درج ہے۔اصل سلسلہ نسب تو حضرت حضرت حسین بن زید ذوالدمعہ سے ملتا ہے لیکن شاید ترتیب دیتے ہوئے سہواً حضرت حسین اصغر بن حضرت زین العابدینؑ سے خلط ملط ہو گیا ہے۔
- اس شجرہ نسب کے مطابق، جناب ابوالفرح واسطی کی نسل کے ایک بزرگ سید محمد یوسف واسطی نے نگینہ میں سکونت اختیار کی۔
- یہ سلسلہ نسب نامکمل حالت میں دستیاب تھا لیکن برادر عرفان علی زیدی کے تعاون سے اس میں تصحیح کے بعد مزید ایک صفحے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ۱۳ صفحات پر مشتمل شجرہ نسب اب نسب نامہ سادات بجنور کا جز بن چکا ہے۔
- تمام اسمائے گرامی دائروں میں درج ہیں جن کو نسبتی خطوط سے منسلک کر کے نسب نامہ ترتیب دیا گیا ہے لیکن کبھی کبھار یہ نسبتی خطوط غائب بھی پائے گئے ہیں۔
- اس شجرہ نسب میں بھی حسب دستور صرف مرد حضرات کے ہی نام درج ہیں۔ کبھی کبھار چند مقامات کا بھی تذکرہ ہے۔چند افراد کی تاریخ پیدائیش بھی درج ہے۔

رہنمائی کی غرض سے میں نے یہ نسخہ کئی عزیز واقارب کے سامنے پیش کیا تھا لیکن مزید واضح اشاروں کا منتظر ہوں۔اب تک میں صرف مصدقہ ہستیوں کا ہی انضمام کر سکا ہوں لیکن امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں مزید پیش رفت ہو گی۔فی الحال میرا مقصد صرف اب تک کی تحقیقات سے آگاہ کرنا تھا۔واسطی زیدی سادات کے سلسلہ نسب نے تحقیق کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔میری دیرینہ خواہش تھی کہ سادات بجنور کے سلسلہ نسب میں سادات سیوہارہ کے بھی کسی مستند شجرے کو شامل کرلوں۔فی الحال اس سلسلے میں صرف اتنی ہی معلومات حاصل ہو سکی ہیں کہ کہ سادات سیوہارہ کے ایک بزرگ رونق رضا مرحوم نے بھی کوئی شجرہ مرتّب کیا تھا لیکن وہ اب مفقود ہے۔رونق رضا مرحوم کا تعلق سلسلہ سادات نہٹور سے تھا لیکن ان کے ایک بزرگ چاند علی سیوہارہ میں آباد ہو گئے تھے۔اس کے علاوہ، سیوہارہ میں زیدی سادات کی ایک اور شاخ بھی آباد ہے جس کا مکمل نسب نامہ دستیاب نہیں ہے۔ان لوگوں کا دعٰوی ہے کہ ان کے آباءواجداد شہنشاہ اورنگزیب کے زمانے میں ایران سے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔

موجودہ نسب نامہ بہر حال سادات بجنور سے تعلق رکھنے والی ان تمام ہستیوں کو شامل کر کے ترتیب دیا گیا ہے جن کے جدامجد حضرت حسن زید شہیدؒ تھے۔اس سلسلے میں کوئی جنسی امتیاز نہیں برتا گیا ہے۔مکمل نسب نامہ کے اندراجات کے مطابق، سادات بجنور کسی خاص مقام سے نسبت کے باوجود مختلف شہروں یاقصبات میں نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔چنانچہ سادات نہٹور کی کئی ہستیوں کی پیدائیش بھی نگینہ، سیوہارہ، شیر کوٹ وغیرہ میں ہوئی ہے۔اسی طرح، چند سادات کے خانوادے بھی مختلف مقامات سے نہٹور منتقل ہو گئے اور باہمی قرابت داریاں قائم کرلیں۔ ممکن ہے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہو لیکن موجودہ حالات میں یہ تفریق کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔

اس موقع پر میں ایک نودریافتہ شجرہ سادات نگینہ (مرتّبہ مرحوم عباس علی بن شریف علی) کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔یہ شجرہ نسب حسن مجتبٰی کے تعاون سے دریافت ہوا ہے اور کئی متعلقہ قرابت داروں نے بھی اپنے آباءواجداد کی اس سلسلے سے وابستگی کی تصدیق بھی کر دی ہے۔اس لئے میں نے اس شجرہ نسب کو بھی اپنے اندراجات میں ضم کر دیا ہے۔

رضوی سادات ترکولہ

حسینی سادات کی ایک اور شاخ

—

اس حصے میں حسینی سادات کی ایک اور شاخ، یعنی رضوی کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد ترکولہ میں آباد تھے۔

رضوی سادات ترکولہ

ترکولہ قصبہ نہٹور کے قریب ایک قریہ ہے۔ یہاں پر زیادہ تر رضوی سادات کی اکثریت ہے جن کی نہٹوری سادات سے کئی قرابت داریاں قائم ہیں۔ان کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ (معروف حسین) بن علی رضا بن موسٰی کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب سے ملتا ہے۔المشجر الوافی (تالیف حسین ابو سعید موسوی) میں بھی ان بزرگ کا ذکر ہے۔ تقسیم ہند کے بعد رضوی سادات کے بیشتر افراد پاکستان منتقل ہوگئے۔ان میں سے کچھ بزرگوں نے اپنا نسب نام محفوظ رکھا لیکن چند شاخیں ایسی بھی ہیں جن کے انساب میں تسلسل برقرار نہیں رہ سکا۔ تحقیقات سے ثابت ہے کہ مرحوم ہاشم رضوی نے ایک شجرہ نسب مرتب کیا تھا لیکن اس کی نقل میں بہت سے نام اور نسبتی خطوط واضح نہیں ہیں۔اس کے باوجود، بیشتر افراد کے اعقاب کے تعاون سے کئی سو قرابت داروں کی شناخت ہو چکی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ برادر عبید رضوی کے فراہم کردہ مخطوطات سے ثابت ہوتا ہے کہ سادات ترکولہ مندرجہ ذیل بزرگوں کی نسل سے ہیں:

1-مرحوم قربان علی تقوی
2۔مرحوم زند علی تقوی
3۔مرحوم محمد غازی رضوی
4۔مرحوم فرخ حسین رضوی

مجھے نسب نامہ کے سلسے میں کچھ ضروری معلومات برادر امجد حسین زیدی (نہٹور) کے تعاون سے بھی دستیاب ہوئی تھیں۔ سادات ترکولہ کے کئی بزرگوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان میں سے کچھ افراد کراچی میں بھی مقیم ہیں مگر کئی خانوادے اب بھی بھارت میں رہائش پذیر ہیں۔

شجرہ سادات امروہہ کے اندراجات کے مطابق، مرحوم زند علی اور قربان علی دراصل حضرت امام تقوی کی اولاد میں سے ہیں۔اس لئے ناموں میں تصحیح کر دی گئی ہے۔اس کے علاوہ، مرحوم ریاست حسین کی یادداشتیں بھی مددگار ثابت ہوئی ہیں لیکن مذکورہ بالا بزرگوں کی آل و اولاد کے تعاون سے یہ رضوی اور تقوی سلسلہ نسب مکمل ہو گئے ہیں۔

نقوی (واسطی) سادات، نہٹور

حسینی سادات کی ایک اور شاخ

—

اس حصے میں حسینی سادات کی ایک اور شاخ، یعنی نقوی (واسطی) سادات کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد محلہ رسولداراں، نہٹور میں آباد تھے۔

نقوی (واسطی) سادات، نہٹور

مرحوم ریاست حسین کی یادداشتوں کے مطابق، نقوی (واسطی) سادات نہٹور کے بزرگ احسان اللہ یا ثناءاللہ امروہہ سے نہٹور تشریف لائے تھے۔ وہ سنبھل سرکار کے گماشتے تھے اور محلہ رسولداران، نہٹور میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ سادات امروہہ کے اندراجات میں بھی احسان اللہ کا امروہہ سے تعلق ثابت ہے۔ سادات رسولداران سے ان کی کثرت سے قرابت داری کے سبب مرحوم ریاست حسین نے اس خانوادے کے متعلقین کے کئی مشجرات اپنی یادداشتوں میں درج کیے ہیں۔ جعفر علی زیدی رسولدار کی اہلیہ بھی ان ہی بزرگ کی دختر تھیں۔ اس کے علاوہ، تذکرہ سادات نہٹور کے مصنف مرحوم عابد حسین کی زوجہ اول اور زوجہ ثانی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

میرے اندراجات میں بھی نقوی (واسطی) سادات کے کئی نام موجود تھے لیکن قدیم مخطوطات اور قرابت داروں کے تعاون سے یہ شجرہ نسب بھی اب مکمل ہو گیا ہے۔

زیدی سادات رسولدار، نہٹور

حسینی سادات کی ایک اور شاخ

—

اس حصے میں حسینی سادات کی ایک اور شاخ، یعنی سادات رسولداران کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد محلہ رسولداراں، نہٹور میں آباد تھے۔

زیدی سادات رسولدار، نہٹور

محترم آغا عبدالرافع گردیزی کی تحقیق کے مطابق، خاندان رسولداران کے اصل مورث میر سید ابوالقاسم ضیاءالدین علی الزعیم زیدی الواسطی تھے جو جلال الدین خلجی کے دور (۱۲۹۰۔۱۲۹۶ء) میں واسط (عراق) سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بعدازاں، ان کے اخلاف میں سے میر علاءالدین دہلی منتقل ہو گئے تھے لیکن ان کے اعقاب میں شامل میر روشن علی رسولدار مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد حکومت (۱۷۱۹۔۱۷۴۸ء) میں ریواڑی میں مقیم تھے۔ مرحوم ریاست حسین رسولدار نے بھی اپنی یادداشتوں میں اس امر کی تصدیق کی ہے۔ المشجر الوافی (مؤلفہ السید حسین ابوسعیدہ الموسوی) میں میر سید ابوالقاسم ضیاءالدین علی الزعیم زیدی الواسطی کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ بزرگ حضرت حسین ذی الدمعہ بن زید شہید کی نسل سے ہیں۔
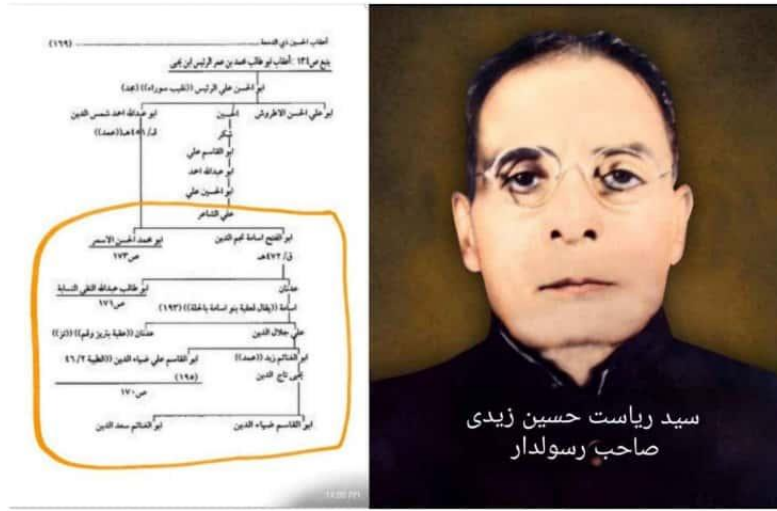
میرے اندراجات میں بھی شبیبہ خاتون بنت ریاست حسین زیدی رسولدار (زوجہ توحید حسین ولد فیض جعفر زیدی) کا تذکرہ موجود تھا مگر اب سادات رسولداران کا سلسلہ نسب مکمل ہو گیا ہے۔۔

زيدي سادات نهتور ضلع بجنور
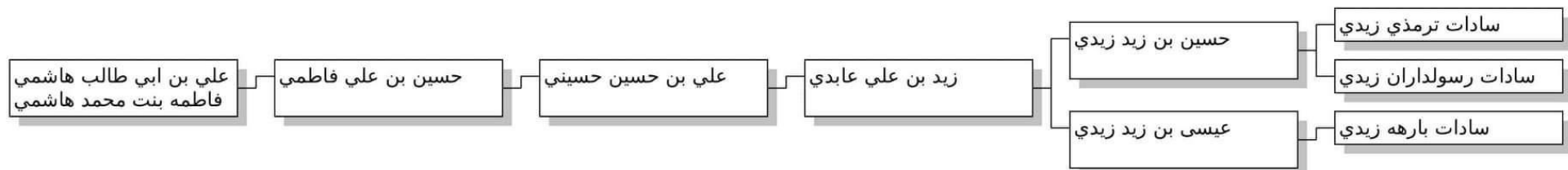
روضہ مبارک سیدالسادات
السید علاو الدین رسولدار
رح زیدی الحسینی
مدینتہ السادات اوچ شریف

روضہ مبارک
السید معزالدین
رسولدار
اوچ شریف

آستانہ عالیہ
السید ریاست حسین
زیدی رسولدار

مرقد سید ریاست حسین
زیدی صاحب رسولدار

دروازہ محلہ رسولداران
نہٹور ضلع بجنور
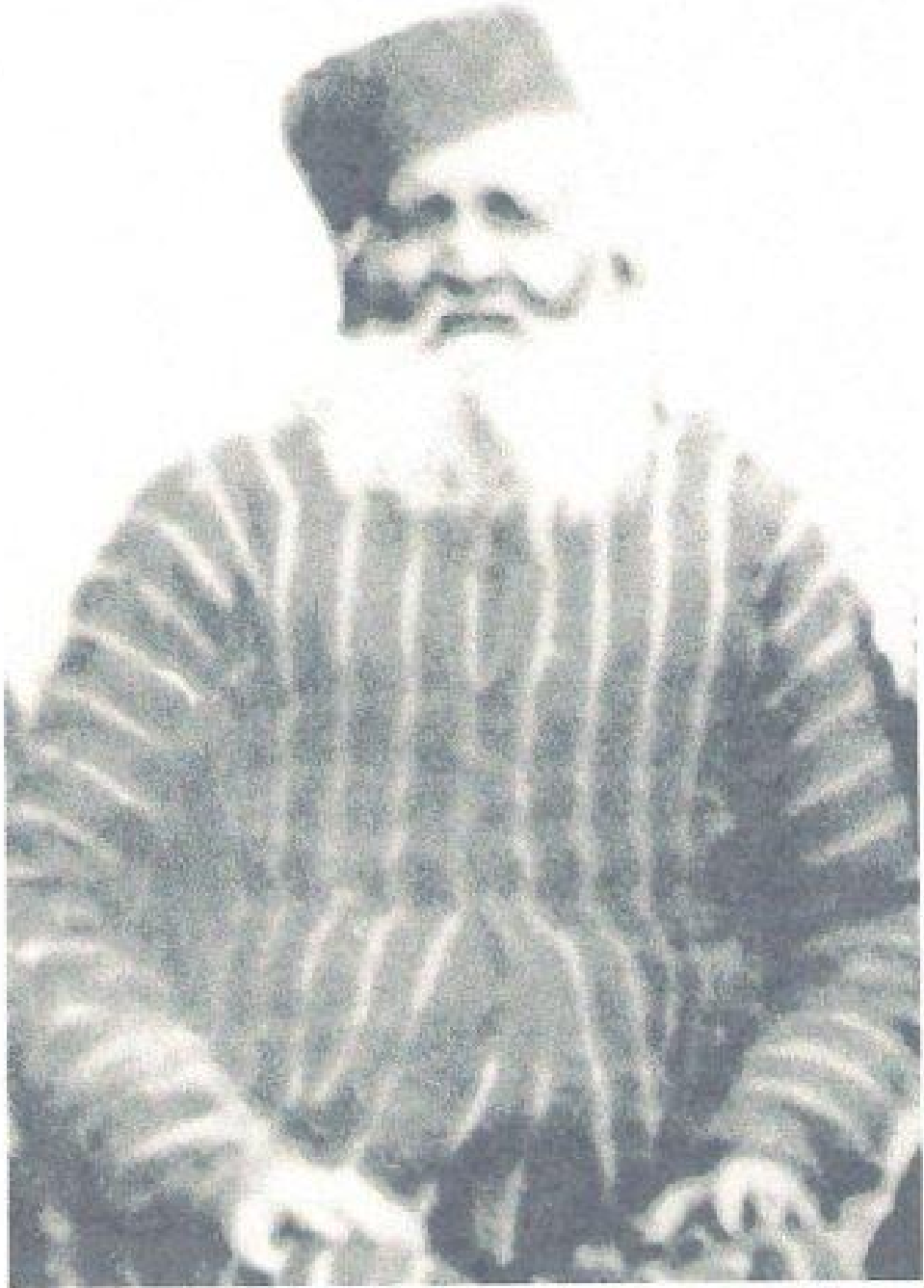
سید عباس علی ولد سید علی بخش رسولدار

Syed Abbas Ali S/O Syed Ali Baksh Rasuldar

سید شاہد حسین ولد سید عباس علی رسولدار

SYED SHAHID HUSSAIN S/O SYED ABBAS ALI
Rasuldar

سید شاہد حسین ولد سید عباس علی رسولدار

سید عشرت حسین ولد سید شاہد حسین رسولدار

سید عباس علی ولد سید علی بخش رسولدار

سید عشرت حسین زیدی
صاحب رسولدار
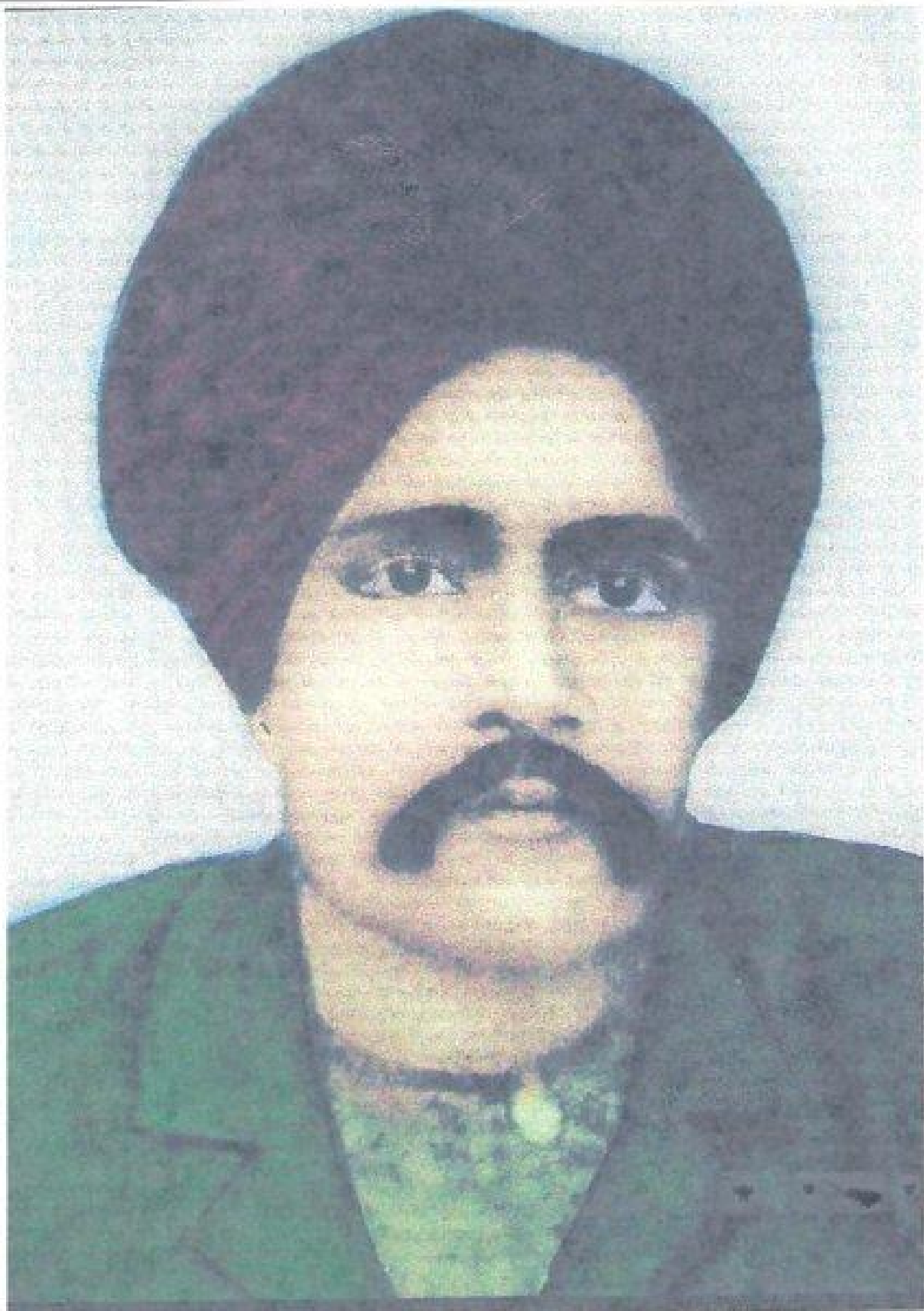
سید عشرت حسین ولد سید شاہد حسین رسولدار

SYED ISHRAT HUSSAIN S/O SYED SHAHID HUSSAIN Rasuldar

سید ریاست حسین زیدی
صاحب رسولدار

مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور

مختصر تعارف :۔ سادات زیدی رسولدار

سادات زیدیہ حسینیہ رسولدار کا تعلق سیدنا زید بن علی بن الحسین علیہ السلام کے فرزند سیدنا حسین ذی الدمعہ۔ذی العبرہ کی نسل سے ہے اس خانوادہ کے مورث اعلی امیر الامراء۔صاحب الجیش السید ابوالقاسم ضیاء الدین علی الزعیم زیدی الحسینی الواسطی المعروف السید ابوالقاسم الواسطی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حلہ عراق میں ایک ہزار سواروں کے امیر تھے آپ کا شجرہ نسب سترہ(17)واسطوں کے بعد سید الشہداء مولانا الامام حسین بن علی علیہ السلام سے مل جاتا ہے آپ کو سید الانبیاء سرور کائنات سیدنا و مولانا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس سے ہند جانے کا حکم ملا چنانچہ آپ اپنے متعلقین اور ایک ہزار شہ سواروں کے ہمراہ وارد ہند ہوئے علاقہ لاڈو سرائے نزد مہرولی دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس ہی مقام پر آپ کا وصال ہوا اور مدفون ہوئے۔ آپ کے فرزند السید معزالدین محمد غازی رح تھے ان کا عقد آپ کے بڑے بھائی السید ابوالغنائم زید الشاعر رح مورث اعلی سادات زیدیہ گردیزیہ جہانگرد کی صاحبزادی سیدہ زہرا خاتون رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ السید معزالدین محمد غازی کے فرزند سید السادات مخدوم السید ابوالحسن علاؤالدین علی رسولدار رح تھے سلطان محمد بن تغلق نے آپ کی خاندانی نجابت اور قابلیت کے پیش نظر آپ کو منصب رسولدار پر فائز کیا اور محمد بن تغلق کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے بھی آپ کو رسولدار کا منصب تفویض کیا اور آپ تاحیات اس منصب پر فائز رہے اور استحکام سلطنت کے لئے کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے رسولدار کا منصب دور حاضر کے مطابق وزیر خارجہ کا عہدہ ہے اس ہی وجہ سے السید علاؤالدین رسولدار رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد برصغیر میں سادات رسولدار کے لقب سے مشہور ہوئی آپ کا وصال مدینۃ السادات اوچ شریف صوبہ پنجاب میں ہوا اور آپ کا مرقد مبارک بھی دربار حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت رحمۃ اللہ علیہ کے قریب مدینۃ السادات اوچ شریف میں موجود ہے آپ کے چار صاحبزادگان تھے جن سے آپ کی نسل چلی اور برصغیر کے مختلف مقامات دہلی۔ فرید آباد۔ ریواڑی۔ ترکیاواس۔ قنوج۔ شہاب الدین پور۔ پہانی۔ کول (علی گڑھ)۔ نہٹور ضلع بجنور۔ برہانپور۔ احمد آباد گجرات۔ ملتان۔ لودھراں۔ بہاولپور سرگودہا۔ ڈیرہ اسماعیل خان ۔ میں آباد ہوئی۔ تقسیم ہند کے آپ کی ہند والی اولاد کے خاندان پاکپتن شریف ۔ جھنگ۔ نواب شاہ۔ حیدرآباد وغیرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور ہندوستان میں آپ کی اولاد میں سے کچھ خاندان نہٹور ضلع بجنور۔ دہلی اور اورنگ آباد میں قیام پذیر ہیں۔ "تحقیق تاحال جاری ہے"۔

راقم الحروف کا تعلق بھی السید علاؤالدین رسولدار رح کے فرزند السید ابو محمد عزالدین حسن کے نبیرگان السید مسعود رسولدار رحمۃ اللہ علیہ والسید جلال رسولدار رحمۃ اللہ علیہ جو لاڈو سرائے دہلی سے محلہ سید سرائے ریواڑی میں آباد ہوئے کی نسل سے ہے اور ہمارے اسلاف عہد مغلیہ میں نہٹور ضلع بجنور میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں اپنی خاندانی لقب کی نسبت سے محلہ رسولداران آباد کیا جو آج بھی موجود ہے قیام پاکستان کے بعد میرے دادا حضور السید ریاست حسین زیدی الحسینی رح رسولدار قصبہ نہٹور ضلع بجنور سے ہجرت کے بعد پاکپتن شریف صوبہ پنجاب میں مقیم ہوئے اور دعوت ولاد عزائے امام حسین علیہ السلام کے سلسلہ کو شروع کیا یہیں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کی جائے مدفن محلہ علی پور پاکپتن شریف میں ہے جبکہ والد صاحب قبلہ السید مروت حسین زیدی الحسینی رسولدار نے اس دعوت ولاد عزائے امام حسین علیہ السلام کے سلسلہ کو جاری وساری رکھا آخر میں سادات زیدی رسولدار کے تمام خانوادوں خاص طور پر خانوادہ سادات زیدی گردیزی رسولدار کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ جو بھی صاحبان اس تحریر کا مطالعہ فرمائیں تو ان کے پاس اپنے خانوادہ۔ بالخصوص مخدوم السید علاؤالدین علی رسولدار رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادگان کے حوالے سے جو معلومات موجود ہیں وہ عنایت فرمائیں تو نوازش ہوگی کیونکہ میں اس خانوادہ پر تحقیق کا کام سرانجام دے رہا ہوں۔

تحقیق وسعادت

السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار سجادہ نشین حضرت قبلہ سید ریاست حسین زیدی رسولدار رحمۃ اللہ علیہ محلہ علی پور پاکپتن شریف

وٹس اپ نمبر۔0300-7579114

اس مضمون کو تحریر کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے حوالہ جات اخذ کئے گئے۔

1 ۔ عمدۃ الطالب 2 ۔ نزہتہ الخواطر 3۔ اخبار الجمال 4 ۔ تاریخ فیروز شاہی 5 ۔ شجرہ طیبہ سید بختیار عباس 6 ۔ تاریخ سادات سید اصغر علی 7 ۔ حیات حکیم سید کرم حسین 8 ۔ علم وادب کے فروغ میں گردیزی مصنفین کردار کا علمی جائزہ 9 ۔ رجسٹر شجرہ نسب خاندان سادات رسولداران نہٹور ضلع بجنور مرتبہ السید ریاست حسین رسولدار 10 ۔ مبارک نامہ 11 ۔ مدرک الطالب
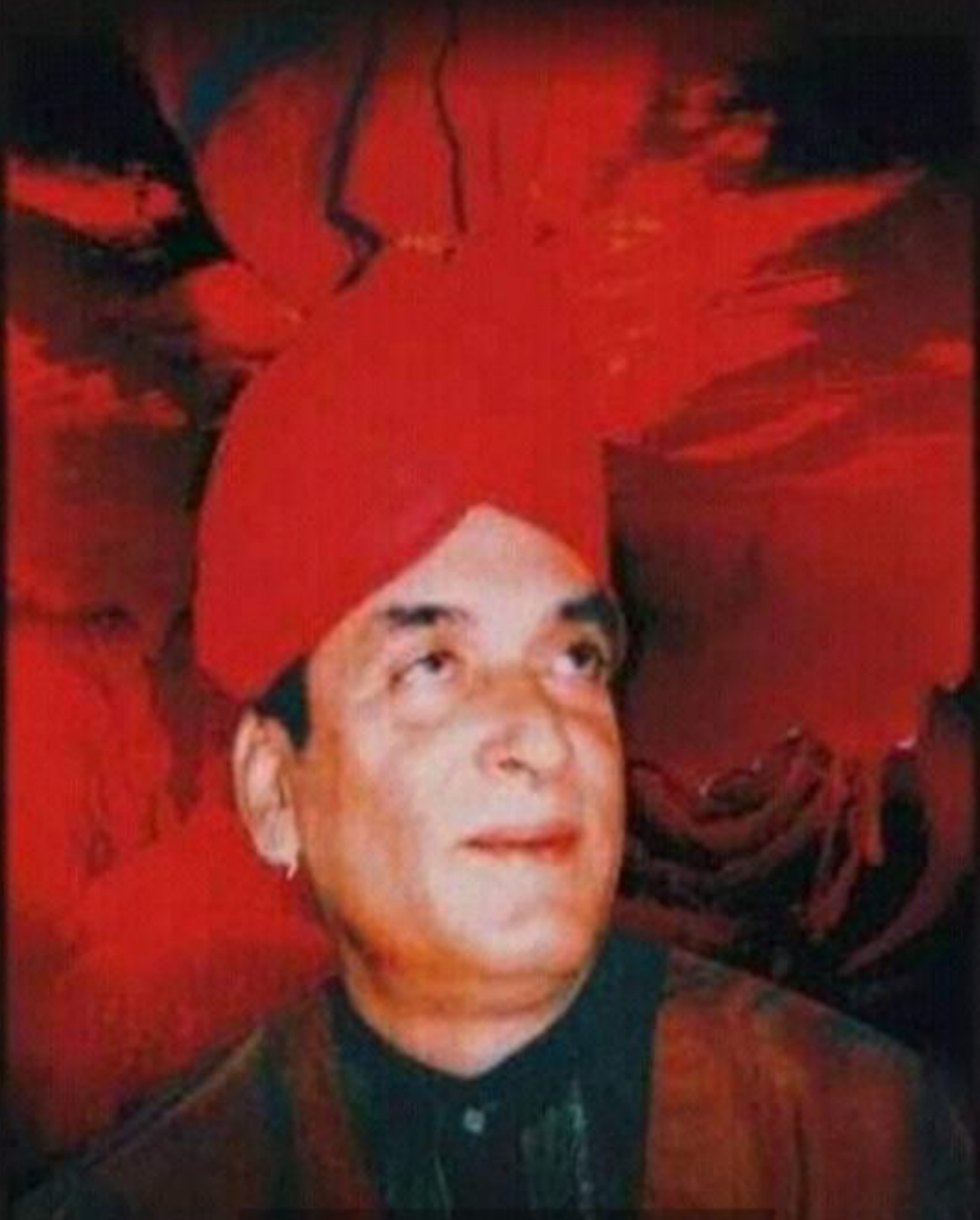
امیر سادات رسولدار
مرشد کامل قلندر دوراں
(سیّد مروت حسین زیدی الحسینی) پاکپتن شریف

السید کاشان رضا
زیدی الحسینی
رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ
السید ریاست حسین
رسولدار
پاکپتن شریف

خاندان دانشمندان (تقوی سادات)، نہٹور

حسینی سادات کی ایک اور شاخ

—

اس حصے میں حسینی سادات کی ایک اور شاخ، یعنی تقوی سادات کا تذکرہ ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ زید پور سے نہٹور تشریف لائے تھے مگر ان کے اخلاف میں شامل مولانا سید محمد اشرف نہٹور سے امروہہ منتقل ہو گئے (تحقیق الانساب مؤلفہ محمود احمد عباسی، دہلی)۔

خاندان دانشمندان (تقوی سادات)، نہٹور

تحقیق الانساب (مؤلفہ محمود احمد عباسی، دہلی) میں خاندان دانشمند کا تفصیل سے تذکرہ درج ہے۔ اس خاندان کے چشم وچراغ مولانا محمد اشرف عہد جہانگیری میں نہٹور سے امروہہ منتقل ہو گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق سادات امروہہ کے اندراجات سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ مولانا محمد اشرف کی اولاد کی قرابت داری ترمذی زیدی سادات سے ثابت ہے اور میرے اندراجات میں بھی اس خاندان کی کئی شخصیات کا ذکر پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام سعد اللہ (یا سعادت اللہ) کا تذکرہ منقول ہے جو مولانا محمد اشرف کے اخلاف میں شامل تھے۔ ان منقولات کا سادات امروہہ کی روایات سے مقابلہ کر کے میں نے اس خاندان کا سلسلہ نسب بھی مکمل کر لیا ہے۔

تحقیق الانساب (مؤلفہ محمود احمد عباسی، دہلی)

خاندان دانشمندان: اس خاندان کے مورث مولانا سید محمد اشرف دانشمند بن سید سعید خاں عہد جہانگیری میں نہٹور (ضلع بجنور) سے امروہہ آئے۔ بزرگوں کا وطن زید پور (اودھ) تھا، جہاں سے ان کے اجداد اولاً جونپور پھر جونپور سے نہٹور چلے آئے تھے، سلسلہ نسب موسیٰ مبرقع بن محمد تقی بن امام علی رضا سے بایں طریق متصل ہوتا ہے۔ مولانا سید اشرف بن سید سعید خاں بن محمد بن داؤد بن خیر الدین بن علاء الدین بن زین الدین بن یوسف الدین بن عبد المجید بن حسن بن داؤد بن زید ثانی بن عبد العزیز بن ابراہیم بن محمود بن زید بن عبداللہ بن یعقوب بن احمد بن محمد الاعرج بن احمد بن موسیٰ مبرقع مذکور۔ صاحب آئینہ اودھ نے سادات زید پور کا جہاں سے اس خاندان کا نکاس بتایا جاتا ہے، سلسلہ نسب یہ تحریر کیا ہے زید بن عبداللہ بن یعقوب بن احمد بن محمد بن حسین بن امام محمد تقی، لیکن از روئے کتب انساب یہ سلسلہ نسب صحیح نہیں ہے، کیونکہ محمد تقی مذکور کا عقب علی تقی اور موسیٰ مبرقع سے باقی رہا، آپ کے کوئی فرزند حسین معقب نہیں برخلاف سادات زید پور کے سادات دانشمند حسین بن امام محمد تقی کے بجائے احمد بن موسیٰ مبرقع بن محمد تقی سے متصل کرتے ہیں، لیکن جو سلسلہ نسب ان کا نخبۃ التواریخ میں شائع ہوا ہے وہ محمد بن موسی مبرقع سے متصل ہوتا ہے حالانکہ حسب تصریح کتب انساب عمدۃ الطالب وغیرہ محمد بن موسیٰ مبرقع سے سلسلہ نسل باقی نہیں رہا۔ رسالہ زیدیہ اور تاریخ واسطیہ میں یہ سلسلہ اس طرح درج ہے۔ زید بن عبداللہ بن یعقوب بن احمد بن محمد اعرج بن احمد بن موسیٰ مبرقع مذکور۔ اس سلسلہ کا ثبوت اگر قدیم شجرہ ہائے نسب سے مل جائے اور یہ امر بھی ثابت ہو جائے کہ ابی عبداللہ بن محمد الاعرج کے کوئی فرزند یعقوب نام تھے تو یہ سلسلہ نسب صحیح اور کتب انساب کے مطابق ہوگا۔ بہر حال اس خاندان کی سیادت تواتر اور شہرت کی بنا پر مسلم ہے۔ اس خاندان کی قرابتیں بھی دیگر سادات فاطمی خصوصاً اولاد شاہ ولایتؒ و قاضی زادگان وغیرہ سے ہوتی آئی ہیں، ان میں عہد سابق سے علماء و فضلا و ارباب باطن ہوتے رہے۔ بعض اشخاص نامور منصب دار و جاگیر دار بھی ہوئے۔

مجموعہ خود نوشت

—

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
و گرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اس حصے میں نیاز مند کی فرمائش پر محترم خورشید عالم زیدی اور محترم میثاق حسین زیدی نے اپنا تعارف خود بیان کیا ہے

میری کہانی میری زبانی

کموڈور (رٹائیرڈ) سید محمد خورشید عالم زیدی پاکستان بحریہ

نہٹور میں چند خاندانوں کے علاوہ، تمام سادات سید حسن نہٹوری کی اولاد میں سے ہے۔ میرے والدین بھی اس میں شامل ہیں۔ سیّد حسن نہٹوری کے آباواجداد (میر سیّد کمال الدین ترمزی) وسط ایشیا سے تبلیغِ دین کے لئے ۱۱۹۱ء میں ہندوستان آئے تھے۔

میرے دادا (کیپٹن سیّد غُلام معین الدین حسن) اور دادی (سیّدہ تائید النساء دختر حافظ محمد سعید اور اصلاح النساء) دونوں کا تعلق نہٹور سے تھا۔ ریاست رِیوہ کی فوج کے سپاہ سالار ہونے کی وجہ سے اُن کا خاندان رِیوہ شہر میں مقیم تھا۔ ۱۹۲۳ء میں خاندان کی روایتی دستور کے مطابق والدین کی شادی نہٹور میں ہوئی۔ شادی کے بعد والدہ (سیّدہ راضیہ خاتون دُختر سیّد اعجاز حیدر پسرِ بُزرگ سیّد جلال الدین حیدر اور سیّدہ مسرور فاطمہ دُختر سیّد عبدالعزیز اور محفوظ اُنسا اُمنیرِ علی) رِیوہ آگئیں۔ رِیوہ کی پسماندہ زندگی والدہ کو پسند نہ آئی۔ ۱۹۲۹ء میں نیا خاندان بدایوں منتقل ہوگیا جہاں والد صاحب (سیّد محمد عالم) کو حافظ صدیق میسٹن اسلامیہ ہائی اسکول میں استاد کی نوکری مل گئی تھی۔ اس شہر میں ۱۸ سالہ قیام کے دوراں ہم سات بھائی [عاصم، حاتم، مصطفےٰ، میں۔ خورشید، اسلم (بادشاہ)، آکرم (قمر)، اعظم] اور دو بہنیں [صبیحہ (رانی)، ہما (گڈّو)] نے والدین اور بڑی بہن نور افشاں (باجی۔ پیدائش نہٹور) کے خاندان میں شمولیت کی۔

ایک زراعتی ضلع ہونے کی وجہ سے بدایوں میں ایک اناج منڈی بھی ہے۔ ماضی میں یہ دارالخلافہ بھی رہ چکا ہے۔ یہاں شمس الدین التمش کی بنوائی ہوئی علیشان جامعہ مسجد شہر کے وسط میں واقع ہے۔ چند ہزار کے شہر میں زیادہ تر ایک دوسرے کو لوگ اگر تفصیلی نہیں تو سرسری طور پہچانتے ضرور تھے۔ بدایوں میں اسلام کا کافی اثر تھا۔ شہر اور اُس کے اطراف میں بہت سے مزارات ہیں۔ اِس کو مدینتہِ اولیاء بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں دو مزار زیادہ مشہور ہیں یعنی بڑے پیر صاحب اور چھوٹے پیر صاحب۔ حضرت نظام الدین اولیا یہاں ہی پیدا ہوے تھے اور اُن کے والد (احمد بدایونی) بھی وہاں ہی مدفون ہیں۔ بہت سے نامور شُعرا کا تعلق بدایوں سے ہے (مثلاً: فانی بدایونی، شکیل بدایونی، ادا جعفری، بیخود بدایونی، دلاور فگار، عصمت چغتائی، شبنم رومانی، وغیرہ) چناچہ اِس کو مدینتہ شعُرا بھی کہا جاتا ہے۔ آئے دن مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ تقسیم سے پہلے بدایوں میں مذہبی کشیدگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ تر مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ میں مسلم لیگ کے ہر جلسے جلوس میں شامل ہوتا۔ کانگریس کا دفتر برابر کے مکان میں تھا۔ وہاں کے عہدیداروں نے ۱۵ اگست کو بھارتی پرچم لہرانے کئے والد صاحب کو دعوت دی تھی۔ گاندھی کے قتل تک حالات حسب معمول رہے۔ شرنارتھی سکھوں کے آنے بعد وہ سکون ختم ہوگیا۔ آس پاس کے مسلمان اکثریتی گاؤنوں میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔

میٹرک کے بعد بڑی بہن (باجی نور افشاں) پہلے علیگڑہ یونیورسٹی اور اس کے بعد آگرہ میڈیکل کالج چلی گئیں۔ دونوں بڑے بھائی بھی میٹرک کر کے علیگڑہ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ بہ دستورِ تقسیم، پوچھنے پر باجی نے تعلیم جاری رکھنے کے لئے پاکستان انتخاب کیا اور کالج کے باقی مسلمانوں کے ساتھ پاک فوج کے دستے کی حفاظت میں لاہور KEMC (جواب یونیورسٹی کہلاتا ہے) میں پڑھائی جاری رکھی۔ بدایوں میں اِس کی اطلاع اُن کا خط جو لاہور سے چند ہفتوں بعد مِلا۔ چند دنوں بعد علیگڑہ والے بھائیوں کو معلوم ہوا جب وہ چھٹیوں پر بدایوں آئے۔ واپسی پر منجھلے (حاتم) تو علیگڑہ پہنچ گئے مگر بڑے (عاصم) بذریعہ بحری جہاز، بمبئی اور کراچی ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔

گھر کے دو بڑے بچّوں کا اتنا دور چلا جانا والدین کے لئے کٹھن تھا۔ والدہ کی بےچینی محسوس کرتے ہوئے، والد صاحب نے لاہور روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھ لے جانے والا سامان لے کر بذریعہ ٹرین کے جنوبی راستہ بیکانیر اور جیسلمیر (راجستان بھارت)، کھوکھراپار (پاکستان) لاہور کے لئے روانہ ہوگئے۔ وہ انتہائی خوشی کے لمحات مجھے اچھی طرح یاد ہیں جب دو (۲) دن ریگستانی علاقہ سے گزرنے کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے ہماری ٹرین پاکستان میں داخل ہوئی تو کھڑکی کے باہر لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت ایک فرحت بخش اور دِل کش نظارّہ پیش کر رہے تھے۔ شاید اللہ کی طرف سے یہ منظری اشارہ یا پیغام تھا کہ اب جہنّم سے نکل کر ہم ازض جنّت میں داخل ہوگئے ہیں۔ بہر حال ہم سب نے خیریت سے پاک سرزمین پر پہنچنے کا باری تعلی کا شکر ادا کیا۔

حیدرآباد سندھ میں ٹرین بدلتے ہوے ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو ہم لاہور پہنچے۔ بدایوں کے مقابلے میں لاہور ایک بہت بڑا شہر تھا، مگر یہاں بھی نکاس کے لئے کھلی نالیاں تھیں۔ گو کہ یہ علاقہ وسطی شہر سے قریب تھا مگر صفائی کے لحاظ سے اچھّانہ تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد ہال روڈ پر دوسرا چار منزلہ مکان ایک اور خاندان کی شراکت کے ساتھ الاٹ ہوگیا۔ ہال روڈ میں ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں والد صاحب کو ۲۵ ایکڑ زرعی قطعہ الاٹ ہوگیا۔ چنانچہ ہال روڈ کا مکان چھوڑ کر سارا خاندان (سوائے نور افشاں باجی کے) ڈیرہ اسمٰعیل خان منتقل ہوگیا۔ والد کو کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ روزگار اوّل شرط کے طور آخر وہاں کے ہائی اسکول میں نوکری کر لی۔ ویسے بھی زمین ریتیلی تھی اور معقول پانی آسانی سے دستیاب نہ تھا گو کہ دریاے سندھ شہر کے برابر سے گزرتا تھا۔ بہر حال تقسیم کے بعد سارے ہندو چلے گئے تھے۔ محلے کے محلے خالی پڑے تھے۔ اُن میں سے ایک چار منزلہ مکان الاٹ ہوا ہمارا مسکن ٹھہرا۔

لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قیام کے دوُران نور افشاں باجی نے ۱۹۴۹ء میں MBBS پہلی دفعہ میں پاس کر لیا اور اس طرح خاندان میں اوّل خاتون ڈاکٹر ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور آرمی میڈیکل کور میں شامل ہوگئیں۔ اُن کو ماری پور کے اڈے پر تعینات کیا گیا جہاں ایئر ہیڈ کوارٹرز بھی واقع تھا۔ نور افشاں باجی کا ساتھ دینے کے لئے دونوں بڑے بھائی بھی ماری پور آگئے، باقی ہم سب والدین کے ساتھ ڈیرہ

اسمٰعیل خان میں رہے۔ قرۃ العین حیدر (عُرف عینی (Anne)۔ میری والدہ کی سگی چچازاد بہن) بھی اِسی عرصے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے باجی کے پاس رہنے لگیں۔ ۱۹۵۰ء میں باجی کو چار کمروں والا فلیٹ مل گیا۔ بڑوں نے فیصلہ کیا کہ دو گھروں کے خرچے اور میلوں کی دوری سے بچا جائے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی زمین اور مکان کو خیر باد کہا اور اس طرح تین سال بعد ۱۹۵۰ء میں خاندان دوبارہ ماری پور میں یکجا ہو گیا۔

نوجوانوں کو فضائیہ کی طرف راغب کرنے کے لیے ایئر اسکاؤٹ مہم ماری پور میں بھی جاری تھی جس میں اسلم (بادشاہ) اور میں شامل ہو گئے۔ اِس میں پُر کشش مشاغل شامل تھے، جیسے، گلائڈنگ (Gliding - Flying engineless aircraft)۔ سال میں ایک مرتبہ، تین ہفتہ کا گلائڈنگ کیمپ پاکستان کے کسی اور بیس میں ہوتا۔ پانچ سال کی شمولیت میں مجھے راولپنڈی، پشاور، پارہ چنار اور تین مرتبہ کوئیٹہ کی سیر کرنے کے موقعے ملے۔ کوئیٹہ میں، میں نے ۸۵۰۰ فُٹ کی اُنچائی (بغیر انجن کے) حاصل کرنے کا رکارڈ بنایا جو شاید آج بھی قائم ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ۱۵۰۰۰ فُٹ سے زیادہ بُلندی پر ہوا باز کو آکسیجن لینا لازم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ میں جہاز پر اکیلا تھا اس لئے تنبیہ دینے اور روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے جہاز میں آکسیجن نہیں تھی۔ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ جہاز کو اور اوپر لے جاوں مگر آکسیجن دستیاب نہ ہونے کی مجبوری کے وجہ سے مجھے اور بلندی پر جانے کا سنہری موقع چھوڑ کر جہاز کو نیچے اُتارنا پڑا۔

۱۹۴۹ء میں بڑے، عاصم بھائی اُورینٹ ایرویز (Orient Airways) میں چلے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں منجھلے، حاتم بھائی فوج میں داخل ہو کر کاکول چلے گئے۔ مجھ سے بڑے، مصطفےٰ نے کراچی میں کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرا اسکول پاکستان نیشنل ہائی اسکول کھارادر میں (میری ویدر ٹاور کے قریب) تھا؛ جسے ایک گجراتی صاحب چلا رہے تھے۔ تقریباً سارے اُستاد اور طلبہ گجراتی تھے۔ ماری پور سے آنا جانا وقت کا کافی مہنگا سودا تھا۔ گھر سے روانگی صبح پانچ بجے اور واپسی شام چار بجے کے لگ بھگ۔ عیسائی مشنری سنیٹ پیٹرک اسکول کی شاخ ماری پور بیس میں بھی تھی جہاں مجھ سے سب چھوٹوں کے لئے کلاس تھیں۔ اُن سب کا داخلہ وہاں ہو گیا۔ خالہ عینی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۷ء تک ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ اِس عرصے میں میری یادداشت کے مطابق انہوں نے کئی افسانوں کے علاوہ کتُب: (پت جھڑ کی آواز)، (میرے بھی صنم خانے)، (صفینۂ غمِ دِل)، (سیتاہرن)، (شیشے کا گھر) وغیرہ ماری پور ہی میں لکھیں۔

تقسیم کے بعد کراچی کی آبادی میں تیزی سے اِضافہ ہوا۔ دریالیاری کے شمالی علاقہ میں کاشتکاری ہوتی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں یہاں دو نئی آبادیوں کے منصوبے بنام ناظم آباد اور لالو کھیت بنائے گئے۔ والد صاحب نے بدایوں کا اٹھارہ سالہ قیام کرائے کے مکانوں میں گزارا تھا۔ مگر والدہ کے اِصرار پر ایک پلاٹ ناظم آباد میں لے لیا۔ مکان بنانے کے لئے پیسے کی کمی تھی۔ ٹھیکہ پر بنوانا اور مہنگا پڑتا۔ یہاں پھر والدہ ہی نے ہمّت دکھائی اور مکان اپنی نگرانی میں بنوانے کا بیڑ اُٹھانے کا اعلان کر دیا۔ تعمیری سامان شہر سے لانا پڑتا تھا۔ کفایت شعاری کے لیے ساری خریداری والدہ خود کرتی تھیں۔ دُور اندیشی دیکھئے کہ سرمایہ مشکل سے ایک منزلہ کا تھا مگر تین منزلہ کی بُنیاد کا ارادہ کیا جو مخلص راج کے مشورے پر چار منزلہ کی بُنیاد ڈلوائی، اور آج عمارت تین منزلہ ہو چکی ہے۔ بہر حال، ایک سال کی جدوجہد کے بعد مکان تیّار ہو گیا۔ بڑے، عاصم بھائی نئے مکان میں والدہ کے پاس منتقل ہو گئے کیونکہ یہاں سے اُن کے کام کی جگہ (کراچی ہوائی اڈا) قریب تھی۔ والدہ نے کچھ غیر شادی شدہ ہجرتی نوجوانوں کو بھی ازراہِ مدّ اور دوسراہت ساتھ رہنے کے لئے بلا لیا۔ والد کی طرح والدہ بھی بہت ملنسار تھیں۔ ناظم آباد میں آس پاس کے رہائشی جن سے اچھی دوستی ہو گئی تھی، اُن سے میل جول جاری رکھا۔ اُنہی میں سے عاصم بھائی کے لئے دلہن (اختر جہان، سی۔ پی۔ سے ہجرت) بھی ڈھونڈلی اور ۱۹۵۶ء میں شادی کروادی۔

۱۹۵۳ء میں مجھ سے بڑے، مصطفیٰ نے کراچی شپ یارڈ میں اپرنٹس ہو گئے۔ مگر کچھ عرصے بعد ہی بہتر مستقبل کے لئے مرچنٹ نیوی میں شامل ہو گئے اور جرمنی میں جہاز پر تعینات ہو گئے۔ ماری پور میں رہتے ہوئے، انٹر کے بعد ۱۹۵۶ء میں (چُپکے سے) میں نے اپنے پسندیدہ پیشے فضائیہ میں پائلٹ کے لئے امتحان دے دیا۔ پاس ہونے پر (Inter Services Selection Board) آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی۔ کال کا مراسلہ جب گھر آیا تو والدہ نے باز پُرس کی اور قطعاً اِجازت نہ دینے کا فیصلہ کن اعلان کر دیا۔ اگلے موقعہ ملنے پر بحریہ کا امتحان دیا جس کے لئے اجازت مل گئی۔ ISSB میں اسّی (۸۰) امیدوار آئے تھے جس میں بحریہ کے چالیس امیدوار تھے۔ کراچی میں چھتیس نے تحریری امتحان دیا تھا مگر صرف دو (علیگڑھ کے صفدر علی اور میں) کو ہاٹ آئے تھے۔ اختتام پر بحریہ میں شمولیت کے لئے صرف چار [شمیم احمد خالد (گجرات)، مختار احمد (جہلم)، کراچی سے صفدر علی، اور میں] کامیاب ہوئے۔

مطلع کی گئی تاریخ ۵ مئی ۱۹۵۶ء کو میں نے منوڑہ جزیرہ میں واقع نیول کیڈیٹ ٹرینگ اسکول میں رپورٹ کردی۔ یہاں نیوی کے آٹھ مخصوص غیر آشنا مضامین کے علاوہ پورا دوسالہ انٹر کالج کا کورس ایک سال میں پورا کروادیا گیا۔ روزانہ کشتی رانی، پیراکی، کھیل اور سینیرز کی لتاڑاِس کے علاوہ۔ ایک سال کے بعد ۲ اپریل ۱۹۵۷ کو میری چار رُکنی کلاس انگلستان کے Britannia Royal Naval College، پہنچ گئی۔ یہ دوسو سالہ قدیم کالج ایک چھوٹے سے شہر Dartmouth کے قریب ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں برطانیہ کے تمام بادشاہت کے مرد اُمیدوار بھی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ کالج میں تقریباً آٹھ سو زیرِ تربیت تھے، جن میں چھیالیس (۴۶) پاکستانی، اٹھارہ (۱۸) سری لنکن، تریسٹھ (۶۳) آسٹریلین، چھے (۶) جنوبی افریقن، پانچ (۵) ملئشین باقی انگریز تھے۔ کالج میں تین سیہ ماہی ٹرم ہوتی تھیں۔ وہ سب کچھ جو منوڑہ میں ایک سال میں کیا تھا (اور انٹر میں دو سال لگا کر) یہاں پہلے تین ماہ میں پورا کروادیا گیا۔ باقی دو سال بھی اِسی رفتار سے تدریس جاری رہی۔

میرے انگلستان روانگی سے پہلے ۱۹۵۷ میں نور افشاں باجی کی شادی، قائدِ اعظم کے مسلم لیگی ساتھی، گیا بہار کے سید حسین امام کے بڑے صاحبزادے سید مظہر علی امام سے ہو گئی تھی۔ اِس لئے خالہ عینی نے گورنمنٹ رہائشگاہ گارڈن روڈ پر اپنے لئے مکان الاٹ کروالیا اور وہاں مُنتقل ہو گئیں۔

جب میں تربیت مکمل کر کے ستمبر ۱۹۵۹ء میں اَنگلستان سے واپس آیا تو ماری پور میں سب کو ایک آٹھ کمروں والے گھر میں پایا جو پچھلے والے چار کمرے والے کے برابر میں ہی واقع تھا۔ شادی نہ ہونے کی وجہ سے میری رہائش جہاز پر ہی تھی۔ انگلستان سے واپسی کے چند ماہ بعد میرے جہاز طغرل کا منیلا، فلپین میں SEATO کی مشقوں کے لئے جانا ہوا۔ معمول کے مطابق بحریہ جہازوں کے بیرونی دورں پر آرمی اور فضائیہ سے ایک ایک افسر مدعو کرتی ہے۔ طغرل پر فلائٹ لفٹنیٹ عابد اور دوسرے (ٹیپو سلطان) پر کیپٹن سرفراز آئے۔ فلائٹ لفٹنیٹ عابد کو میں ماری پور سے جانتا تھا اور دوستی بھی تھی۔ کولمبو اور سنگاپور

میں مختصر قیام کرتے ہوے ہم ایک ہفتہ میں منیلا پہنچے۔ یہی ہمارا واپسی کا راستہ بھی تھا۔ کراچی سے سنگاپور کی واپسی تک سمندر معمول سے بہت زیادہ پُر سکون رہا۔ سنگاپور سے روانگی شام کو ہوئی۔ چند گھنٹوں کے بعد جیسے ہی جہاز آبنائے ملاکا(Malacca Straits) سے کھلے بحرِ ہند میں داخل ہوئے سمندر کے تیور بدل گئے۔ قد آور لہروں (۲۰ سے ۲۵ فُٹ بُلند) کی وجہ سے جہاز میں چلنا پھرنا تو در کنار کھڑا ہونا بھی مشکل ہو گیا اور باورچیوں کو کھانا پکانے تک میں بھی دُشواری ہو رہی تھی۔ کولمبو پہنچنے تک تین راتین اور دو دنوں تک مسلسل یہی کیفیت جاری رہی۔

طغرل میں ڈیڑھ سال قیام کے بعد میرا تبادلہ دوسری جنگِ عظیم کی ساختہ گن بوٹ SDML ۳۵۱۷ پر ہو گیا جس کا بیس چٹاگانگ میں تھا۔ یہ ایک چھوٹی مسلح کشتی دریاوں لئے موزوں ہوتی ہے۔ صرف ایک افسر ہوتا ہے، باقی عملہ۔ یعنی کپتان کو اپنی مرضی چلانے کی پوری آزادی۔ کمان سمبھالنے کے فوراً بعد مجھے کھلنا جانا پڑا جہاں سمندری پیمائش والے جہاز ذوالفقار کے کام میں مدد کرنی تھی۔ شومئ قسمت، چٹاگانگ سے نکلنے کے چند گھنٹے بعد ہی دو میں سے ایک انجن بند ہو گیا۔ بہر حال ایک انجن پر مقرّہ جگہ سندربَن کے علاقے میں چھ گھنٹے تاخیر سے پہنچ گئے۔ انجن کی مرمت کھلنا شپ یارڈ نے چار ماہ میں کی۔ دوسرا انجن بھی اچھی حالت میں نہیں تھا۔ اِس کی مرمت نارائن گنج شپ یارڈ (نزد ڈھاکہ) میں ہوئی اور وہی چار ماہ لگے۔ یہ تاخیر قدرت کی مہربانی تھی۔ جیسے ہی مرمت مکمل ہوئی چٹاگانگ ایک بڑے طوفان کی زد میں آگیا۔ چٹاگانگ میں موجود ساری چھوٹی کشتیں بشمول دو گن بُوٹس کے جو بیس میں تھیں غرق ہو گئیں۔ میری بُوٹ نرائن گنج میں ہونے کی وجہ سے بچ گئی۔ مجھے فوراً چٹاگانگ بُلا لیا گیا اور طوفان زدہ علاقوں میں امدادی کارروایوں کا کام سُونپا گیا۔ تین ہفتے تک لاشیں دریا کرنافلی بہتی رہیں۔ اُن کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

۱۹۶۲ء میں بحریہ نے آفسروں کی تربیت پاکستان ہی میں شروع کی۔ ایک سال گَن بُوٹ کمان کے بعد مجھے نئی Naval Academy میں تدریس کے لئے بابر (کروزر، یعنی سب سے بڑے جہاز) پر تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں نورافشان باجی کا تبادلہ PAF بیس کورنگی کا ہو گیا۔ چناچہ ماری پور سے والدین بمعہ باقی تمام حاضر بچّوں کے اپنے ناظم آباد کے گھر میں منتقل ہو گئے۔ اسال بعد یعنی ۱۹۶۴ء میں نورافشاں باجی نے نوکری سے فراغت لے کر کراچی ناظم آباد کے گھر میں منتقل ہو گیں۔ اسی زمانے میں میری شادی اپنی ماموں زاد (سیّدہ گیتی آرا دُخترِ بزرگ سیّد امتیاز حیدار اور جمیلہ ابرار حیدر) سے ہو گئی۔ کچھ عرصے والدین کے ساتھ رہنے کے بعد اللہ کی مہربانی سے نیوی کی طرف سے والدین کے گھر سے سو(۲۰۰) گز کے فاصلہ پر مکان الاٹ ہو گیا۔ فضائیہ سے فراغت بعد نورافشان باجی نے ناظم آباد ہی میں گھر کے قریب دو کمرے کرائے پر لے کر ذاتی مطب کھول لیا۔ چند سال بعد شمالی ناظم آباد، جہاں نئی آبادکاری ہو رہی تھی، ایک پلاٹ لے کر چار کمرے بنوا کر امام کلینک کے نام سے مطب وہاں مُنتقل کر لیا۔ ابھی کلینک کی تعمیر جاری تھی کہ اُن کے شوہر سیّد مظہر امام کا ۱۹۷۳ء میں انتقال ہو گیا۔ گو کہ اُن کے دونوں بچّے ابھی چھوٹے تھے مگر والدین کے ساتھ رہنے کی وجہ سے گھر سے بے فکر ہو کر اُنہوں نے پوری توجّہ کلینک پر لگاء۔ ماشااللہ، آج یہ کلینک دو سو(۲۰۰) بستروں کے ہسپتال کی بلوغیت پر پھر پہنچ گیا ہے اور مزید فروغ پا رہا ہے۔

اگست ۱۹۶۵ء میں مجھے Communication specialist کورس کرنے انگلستان بھیجا گیا مگر جلد ہی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے واپس بُلا لیا گیا۔ مجھے نیول اکیڈمی میں واپس بھیج دیا گیا مگر چند ماہ بعد ہی دوبارہ اُسی (Communication Specialization) کورس پر انگلستان چلا گیا۔

ایک سال بھی نہ گزرا ہو گا کہ مارچ ۱۹۶۸ء میں عاصم بھائی کا تبادلہ لندن کا، اور میرا چٹاگانگ کا ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں میرا چٹاگام کا قیام دوسرا تھا جو دو سال رہا۔ ۱۹۶۹ء کے اختتام میں ایوب خان کے دس سالہ دور ختم ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ شہر میں ہندو دھوتی نظر آنے لگیں جو کبھی پہلے ناپید تھیں۔ مظاہروں میں شدّت آنے سے پہلے ہی میرا تبادلہ واپس کراچی Fleet Commander (COMPAK) Headquarter میں ہو گیا۔ یہاں کے دو سالہ قیام کے دوران حج کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ سعودی نیوی نے دعوت دی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں حج پر جانے سے پہلے درمیان کی بہن صبیحہ (رانی) کی شادی اُن کے یونیورسٹی کے مائکروبایولجی کے استاد عیسیٰ محمد عبداللہ سے ہو گئی جو اپنے کالج کے زمانے میں ٹیبل ٹینس کے چیمپین بھی رہ چکے تھے۔ عیسیٰ بھائی کے والد ڈاکٹر تھے اور ممبئی میں قیام پزیر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ بہ فیملی کراچی آگئے تھے۔ صبیحہ کی شادی کے چند دن بعد میرا تبادلہ ٹیپو سلطان جہاز پر ہو گیا۔ ساتھ ہی چھوٹے بھائی اسلم (اب میجر ہو گئے تھے) کا تبادلہ جی۔ اِیچھ۔ کیو پنڈی سے ڈھاکہ ہو گیا، نتیجتاً جنگ کے بعد اُنہیں دو سال ہندوستان کا مہمان رہنا پڑا۔ جنگ کے بعد جنوری میں بیٹے فرید کی ولادت ہوئی جس کے چند ماہ بعد میرا تبادلہ نیول ہیڈ کوارٹر کا ہو گیا۔ یہاں چار سالہ تعیناتی کے دوران ہیڈ کوارٹر کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ اُس زمانے میں اسلام آباد کی آبادی بہت کم تھی۔

اسلام آباد آئے ابھی سال بھی نہ ہوا تھا کہ عجلت میں سری لنکا اور مالدیپ کے ڈفنس اٹیچی (Defense Attaché) کے عہدے پر چلا گیا۔ سری لنکا جانا ایک نیا مگر خُوشگوار تجربہ تھا۔ واپسی پر کراچی میں ۱۹۷۷ء الیکشن کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے لنکا کے قیام کے دوران سب سے چھوٹے بھائی اعظم نے کراچی سے MBA کر لیا اور ابو ظھبی میں BCCI میں شامل ہو گئے۔ چند ماہ بعد اُن کی شادی خالہ زاد بہن کی بڑی بیٹی گیتی نعمانی سے ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ کنیڈا ہجرت کر گئے۔

۱۹۷۹ء میں سری لنکا سے واپسی پر مجھے عالمگیر اور پھر بدر جہاز کی کمان ملی، جس کے بعد پھر نیول ہیڈ کوارٹر اسلام آباد کا تبادلہ ہو گیا جہاں دو سال بعد نیشنل ڈِیفنس کالج سے ایک سالہ کورس کیا جس کے دوران چین کا دو ہفتہ دورہ بھی شامل ہے۔ اِس کورس کے دوران چھوٹی بہن کی شادی نثار حسن سے ہو گئی جن کے خاندان سے ماری پور کے زمانے سے دوستی تھی۔

۱۹۸۳ء میں نیشنل ڈِیفنس کالج کے کورس کے اختتام پر میرا تبادلہ ساڑھے تین سال کے لئے کمانڈر کراچی کے چیف اِسٹاف افسر کے عہدہ پر ہو گیا۔ بحریہ میں یہ عہدہ مصروف ترین سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہاں نہ صرف تمام کراچی کے یونٹوں کی کارگردگی پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور اس کے علاوہ تینوں افواج کے استقبال اور مہمانداری کے امور کے انتظامات کی بھی ذمہ داری نبھانی پڑتی تھی جس میں بیرون ممالک کے وفود اور پاکستانی بڑے افسران کی کراچی آمدورفت کی دیکھ بھال بھی شامل تھی۔

کراچی کی تین سالہ گہما گہمی کے بعد ۱۹۸۶ء میں مجھے ISI اسلام آباد مُنتقل ہونا پڑا۔ جیسا نام سے ظاہر ہے، یہ تینوں افوج کا ایک مشترکہ اِدارہ ہے۔ یہاں مجھے بحریہ اور فضائیہ دونوں کے امور کی دیکھ بھال کا شرف مِلا۔ یہاں بھی میرا تین سالہ قیام دلچسپ اور پُر خبر تھا۔ آئی۔ اِیس۔ آئی میں قیام کے دوران ہی اُجھڑی کیمپ کا واقعہ پیش آیا۔ فیصل مسجد کا افتتاح ہوا جس سے میری رہائش دو سو گز کی فاصلے پر تھی۔ اُس کے چند ہفتوں بعد ضیاء الحق صاحب کا حادثہ اور انکی فیصل مسجد کے احاطہ میں تدفین کے واقعات ہوئے۔

پاک افواج میں یہ رواج ہے کہ نوکری کے اختتام سے پہلے آخری تعیناتی آبائی رہائش کے قریب ہو تاکہ آئندہ کے لئے انتظام کرنے میں سہولت ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء میں میرا آخری تبادلہ کراچی میں واقع (اب لاہور میں واقع ہے) نیول وار کالج (جو اُس وقت نیول سٹاف کالج کہلاتا تھا) میں ہو گیا۔

اِسٹاف کالج کے قیام کے دوران آسٹریلیا جاتے ہوئے سنگاپور میں چند گھنٹے قیام تھا۔ اِس وقفہ کے دوران میرا ایک کمپیوٹر کی دُکان میں جانے کا اِتفاق ہوا۔ اُس وقت گھریلو کمپیوٹر نئے نئے متعرف ہوئے تھے۔ میں نے بچّوں کے لئے ایک لیا ہُوا تھا۔ دُوکان میں مجھے شجرہ بنانے کے کچھ پروگرام نظر آئے جس سے مجھے ایک سیاہ فام امریکی کی لکھی کتاب Roots By Alex Haley کی یاد تازہ ہو گئی۔ اِس کتاب میں مصنّف کو خیال آتا ہے کہ اُس کے آباواجداد تھے تو افریقہ سے لائے گئے غُلام مگر کس ملک سے لائے گئے تھے۔ اِس کی جُستجو میں وہ اپنے باپ دادا سے شروع کرتے ہوئے اپنے خاندان کی جڑ تک پہنچ نے کی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے جس کے لئے اُسے اُن شہروں کے بلدیہ ریکارڈ سے رجوع کرنا پڑتا ہے جہاں جہاں اُس کے پچھلی پُشتوں کے بُزرگ رہ چکے تھے۔ ایک عشرے سے زیادہ عرصے کی کاوش کے بعد اپنے خاندان کے جڑ مغربی افریقہ کے ملک گیمبیا میں ڈھونڈ پالیتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ مصنّف کی کامیابی کی بُنیاد امریکہ کی ہر بلدیہ میں رکارڈ کے کھاتے دستیاب ہونے کی وجہ تھی۔ مگر ہمارے یہاں زیادہ تر یہ خزینہ صرف خانداں کے چند لوگوں کے زہنوں میں مدفوں ہوتا ہے۔ اور اِس کو مستقل محفوظ کرنا اشد ضروری ہے اِس سے پہلے کہ یہ خزانہ وقت کے ساتھ ضائع ہو جائے۔ بے اختیاری طور ایک شجرے کا پروگرام اُس کی خوائص دیکھ کر خرید لیا۔

خاندان میں ایک شجرہ پہلے سے موجود تھا جسے انجمنِ ساداتِ نہٹور (رجسٹرڈ) نیوٹاون جامع مسجد کراچی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ جامع مسجد نیوٹاون خاندان کے بزگوں نے قائم کی تھی جنہوں نے تقسیم کے بعد کراچی میں رہائش اختیار کی تھی۔ اِن سب سے زیادہ سر گرم باپ بیٹے سیّد محمد جمیل ولد سیّد محمد خلیل تھے۔ اِن باپ بیٹے نے جامعہ مسجد نیوٹاون کے علاوہ خاندان کو اکھٹا کرنے کے لئے ایک اور ادارہ بھی انجمنِ ساداتِ نہٹور (رجسٹرڈ) کے نام سے قائم کیا جو پابندی سے ہر ماہ خاندان کی خبروں کا ایک ماہ نامہ رسالہ بنام مرقع ساداتِ نہٹور پابندی سے شائع کئی برس تک کرتا رہا۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے کئی اور مدرسے اور مساجد بھی قائم کئے مثلاً حیدر آباد کالونی، جیل روڈ (عقب میں کشمیر روڈ) اور شہیدِ ملت روڈ کے سنگم پر واقعہ مساجد، ملیر اور لانڈھی میں مدرسے۔ اِس کے علاوہ کئی جگہ مساجد اور مدرسوں کیلیئے بڑے پلاٹ حاصل کئے جن میں سے بیشتر پر اب قبضہ ہو چکا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ دونوں تبلیغی دوروں پر بھی جاتے۔ اُنہوں نے جنوبی کوریا میں اسلام متعرف کیا اور اُس کے دارالحکومت میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی جس کے دیکھنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا۔ دونوں باپ بیٹے (جمیل صاحب لاولد تھے) کے انتقال کے بعد کئی دوسرے بُزرگوں نے جامع مسجد، اشاعت القران اور انجمنِ ساداتِ نہٹور کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے رہے جن میں حافظ عبدالرشید (ولد عبدالعزیز) نمایاں ہیں۔ اِنہوں نے نہ صرف تمام امور کی تندہی کے ساتھ نبھائے بلکہ ایک مخلص اور جزبے سے سرشار رشتہ داروں کی ٹیم بنا کر خاندان کا شجرہ مرتّب کرنے کا کام شروع کیا۔ کئی سال کی کاوشوں کے بعد ۱۹۶۳ء میں اِس کا ثمر ایک چھپے شجرے کی شکل میں خاندان کو پیش کیا۔ مگر اِس میں روایتاً صرف مرد حضرات کا ذکر تھا جو میری سوچ کے حساب سے ایک بہت بڑی کمی تھی۔

میں نے جو پروگرام سنگاپور میں لیا تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اُس میں مرد اور خواتین دونوں کے اندراج کرنے کی گنجائش تھی۔ موجودہ خواتین کا اندراج تو مشکل نہیں تھا، مگر پچھلی پُشتوں کے لئے دشواری تھی کہ کہاں سے پتہ کیا جائے۔ خُوش قسمتی سے یہاں والدہ صاحبہ کی زیرک یادداشت نے مسئلہ حل کر دیا۔ اُنہوں نے نہٹور کو ۱۹۲۹ء میں سترہ (۱۷) سال کی عمر میں خیر باد کہا تھا اور اب ۱۹۹۰ء تھا۔ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چُکا تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے دو سال کے عرصے میں مجھے تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) نام بمعہ ہر خاندان کی ترتیب وار اولاد اور ساتھ ہی اُن کے ناموں کے اندراج کروائے۔

والدہ صاحبہ کے فراہم کردہ ناموں کی صحت کی تصدیق ہونیکا نہ کوئی امکان اور نہ ہی کوئی طریقہ نظر آتا تھا۔ پھر اچانک ایک غائبانہ موقع اللہ نے مہیا کر دیا۔ اُس کا ذریعہ ایک بُزرگ تنظیم حُسین بنے جو پہلے (۱۹۶۳) شجرے کی اشاعت سے مُنسلک رہے تھے۔ ۱۹۹۹ء میں تنظیم حُسین صاحب کے نہٹور میں مقیم بڑے بھائی شمیم حُسین نے اپنے دادا جناب عابد حُسین صاحب کا تحریر کردہ تقریباً دو سو (۲۰۰) سال پُرانہ شجرہ چھوٹے بھائی (تنظیم حسین) کے پاس اُن کے بیٹے ندیم کے ہاتھ کراچی بھجوا دیا۔ مجھے اِس کی بھنک ملی تو میں نے ٹیلیفون پر تنظیم صاحب سے اِس شجرے کی درخواست کی کہ کچھ عرصے کے لئے مجھے عنایت کر دیں تاکہ میں اپنے شجرے کے اندراج کی تصدیق کر لوں، مگر اُنہوں نے یہ کہ کر صاف انکار کر دیا کہ میاں یہ شجرہ فارسی میں ہے، تُمہارے کام کا نہیں۔ میرے اصرار پر وہ اِس بات پر راضی ہوئے کہ میں اپنے سوالات اُن کے پاس لاؤں اور وہ فارسی دان ہوتے ہوئے جواب نکال کر دے دینگے۔ چُنانچہ میں چھ نکات ساتھ لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عابد حسین صاحب کا شجرہ دراصل سات عدد دبیز (ڈھائی انچ موٹی) جلدوں پر مشتمل ہے۔ بہر حال میں نے تنظیم صاحب کو پہلا نام پیش کیا تو چالیس منٹ کی کوشش کے بعد جواب ملا۔ میں نے دوسرا آگے رکھا تو اِس مرتبہ پینتالیس منٹ لگے۔ تیسرا سامنے کیا تو کہنے لگے 'یار تم یہ جلد ہی ساتھ لے جاو، مگر کام ختم ہونے پر واپس اسی حالت میں کرنا'۔ گھر آ کر شجرہ کھولنے پر اصل حقیقت سامنے آئی۔ نہ صرف یہ کہ شجرہ نصر کے طرز پر لکھا ہوا تھا بلکہ اسکی تحریر بھی پُرانے طرز کی تھی یعنی ضروری نہیں کہ ہر جگہ نقطے اور مد وغیرہ لگے ہوئے ہوں جیسے ایک زمانے میں خطِ شکست ہوتی تھی۔ میں نے پچپن سال پہلے ہندوستان میں ساتویں کلاس تک فارسی پڑھی تھی۔ مشکل سے پڑھائی کے بعد شجرے کا کچھ مفہوم سمجھ میں آنا شروع ہوا۔ بہر حال کوشش جاری رکھی اور چند دنوں میں واجبی سی روانی آ گئی۔ تین مہینے میں پہلی جلد مکمل کر کے واپس کی تو تنظیم صاحب نے دوسری جلد تھما دی۔ چند ماہ جب اُسے واپس کر کے تیسری کی درخواست کی تو کہنے لگے کہ بھئی تم ساتوں جلدیں لے جاو، کام ختم ہونے پر واپس کر دینا۔ ساری جلدوں کا موازنہ کرنے میں ڈھائی سال لگے۔ یہ ایک قابل ستائش اور حیران کن بات تھی کہ والدہ صاحبہ کے فراہم کردہ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) ناموں میں اور عابد حُسین صاحب کے شجرے میں اندراج میں مکمل مطابقت تھی۔ کیونکہ اس عرصے میں میری فارسی بھی بہتر ہو گئی تھی تو میں نے ساتوں جلدوں کی ایک اور گردان کر ڈالی تاکہ جو نُکات چھوٹ گئے ہوں وہ بھی نظر میں آ جائیں اور اِصلاح کر لی جائے۔ دوسرے پھیرے میں تقریباً سال لگا اور کی اندراج میں تبدیلی، اضافہ یا ترمیم کرنی پڑی۔ میں نے دونوں شجروں کے موازنے کے بعد ساتوں جِلدیں تنظیم صاحب کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیں۔

۲۰۰۲ء میں امریکہ کی رہائشی ڈاکٹر سہیلہ زوجہ ڈاکٹر مشرّف علی اور دُختر مشرّف علی و خورشید فاطمہ مستحسن سعید) کراچی آئیں۔ وہ خود اور انکے شوہر (اور خالہ زاد) ڈاکٹر مشرّف علی (فرزند سیّد مہدی حسن اور عرُوج فاطمہ مستحسن سعید) دونوں امراضِ قلب کے ماہر ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر سہیلہ شجرے سے بہت لگاؤ رکھتی ہیں۔ اِس سلسلہ سے وہ میرے گھر آئیں اور تقریباً چھ گھنٹے قیام میں میرے شجرے کی تفتیش کرتی رہیں۔ میں نے اپنے شجرے کو پندرہ فلاپی ڈسکس (Floppy Discs) میں کاپی کر کے دیا جسکو امریکہ میں اُن کے بیٹے بلال حسن نے اُن کے کمپیوٹر میں منتقل کر دیا۔ اُن کے گھر میں قیام کے دوران میں نے اُن سے تنظیم حسین صاحب کی تحویل میں اُن کے دادا سیّد عابد حسین کے شجرے کا ذکر بھی کیا۔ ڈاکٹر سہیلہ نے عابد حسین صاحب کے شجرے کی ساتوں جلدوں کی فوٹو کاپی کروالی اور اپنے ساتھ امریکہ لے گئیں۔ نومبر ۲۰۰۲ء میں تنظیم حُسین کے انتقال کے بعد عابد حُسین صاحب کا شجرہ اَب اُن کے بیٹے ندیم حسین کے پاس ہے۔

شجرے کا مواد جمع کرنے کے لئے زیادہ تر مجھے لوگوں کے گھر جانا پڑتا، جس کے لئے میں نے ایک لیپ ٹاپ (Laptop) رکھا۔ مگر اب کبھی کبھی ہی اس کی ہمّت ہوتی ہے۔ بہر حال، یہ کام جاری کئے ابھی سات آٹھ سال گزرے ہونگے کہ ۱۹۹۷ء میں ناگہانی ایک غیبی مدد آگئی۔ اللہ نے عمران متانت حُسین (عرف روفی)، ولد بھائی سید شجاعت حُسین مرحوم، کو مدد کرنے کے لئے نامزد کر دیا۔ اُنہوں نے تندہی کیسے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا جس سے شجرے کا حُجم تیزی سے بڑھنے لگا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اِس کام میں آج بھی اُسی تندہی سے لگے ہوئے ہیں بلکہ اِس میں بہت انمول بہتری لے آئے ہیں۔ روفی نے کمپیوٹر پروگرامی کے کورس کنیڈا میں کئے ہیں۔ اِس کی وجہ سے اُنہوں نے شجرے میں اندرونی خامیوں تک رسائی حاصل کر کے اُن کو دور کرنے کا باریک بینی والا کام ایک طویل عرصے کی عرق ریزی کے بعد یہ قابلِ ستائش کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔

ویسے تو بہت سے کرم فرما رشتے داروں نے اَہم معلومات فراہم کیں ہیں مگر روفی کے علاوہ چچازاد بھائی سیّد غلام محی الدین زیدی نے بھی کلیدی مدد کی ہے۔ مُحی الدین فطری طور پر ملنسار ہیں اور سب رشتہ داروں کی خبر گیری بھی کرتے رہتے ہیں۔ رشتے داروں میں اُن کا دائرہ احباب کافی وسیع ہے، بشمول اُن کے جنھوں نے ہندوستان سے ہجرت نہیں کی۔ آج بھی جب کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے وہ فوراً اُس کی اطلاع دیتے ہیں۔

بُزرگوں (سیّد محمد خلیل اور سیّد محمد جمیل) کی تقلید کرتے ہوئے، خاندان کو یکجا کرنے کی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی۔ ماضی کے مقابلے میں آج کل کے حالات میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ دُنیا سُکڑ گئی ہے اور رشتے دار دُنیا بھر میں پھیلے گئے ہیں۔ مگر اِس عرصے میں تیز رفتار تکنیکی ارتقا نے نہ صرف بہت سے مسائل کو آسان کر دیا ہے بلکہ بیشتر امور کی تکمیل کے وقت کو ناقابلِ یقین حد تک سمیٹ دیا ہے۔ جہاں پیغام مطلوب تک پہنچنے میں ہفتے بلکہ مہینے لگ جاتے تھے اب چشم زدن میں یعنی فوراً ہوتے ہیں۔ اِن جدید سہولتوں کا سہارا لے کر میں نے رشتیداروں کے E-mail اور ٹیلیفون نمبروں کے کھوج شروع کی، خاص طور پر وہ آج بھی ہندوستان کے باسی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ شجرے کا مستند مواد جلد مل سکے۔ ساتھ ہی اخبار کے طرز کی ایک Website کرائے پر لی تاکہ خاندان کی خبروں کو رشتے داروں تک دنیا بھر میں آسانی سے پہنچایا جاسکے۔ اِس برقی اخبار کا نام بھی پُر انار کھا یعنی مرقع ساداتِ نہٹور۔ گو کہ اِس اخبار میں تقریباً ڈھائی سو (۲۵۰) نے شمولیت حاصل کی مگر ہفتہ میں کم سے کم ایک دفعہ آنے والوں کی تعداد شاذ و نادر ہی پندرہ (۱۵) سے بڑھی ہو۔ البتہ اِس اخبار کا ایک مثبت فائدہ یہ ہوا کہ ممبران میں ایک تحریک اُبھری کہ خاندان کی یکجہتی، اتحاد اور فلاح کے لئے ایک ادارہ تشکیل دیا جائے خاندان کے نادار اور بے سہارا افراد کی امداد کا فوری انتظام کرے۔ سب ممبران کے اتفاقِ رائے سے سیّد میثاق حسین زیدی (پسرِ بزرگ سیّد اشتیاق حسین زیدی اور سیّدہ عزیزہ خاتون بنتِ مولانا سیّد عبدُالغفور) سے اِس کام کا بیڑا اُٹھانے کی درخواست کی گئی جو اُنہوں نے بخوشی قبول کر لی۔ میثاق بھائی نے بڑی عرق ریزی سے اِس ادارے کے قوانینِ عملداری مرتّب کئے اور اُس کا نام انجمنِ فلاح و بہبود ساداتِ نہٹور (Sadat-e-Nehtor Welfare Society) تجویز کیا۔ دونوں نکتے اتفاقِ رائے سے منظور ہو گئے۔ فلاحی کاموں کے لئے ممبران نے چندہ بھی دینا شروع کر دیا جن میں سیّد رشید علی شاہ (ولد حاجی امیر علی شاہ اور شمس النسا صاحبہ) مستقل مقیم ہالینڈ سب سے زیادہ مُتحرک اور پیش پیش تھے (رشید بھائی کا اچانک ایک معمولی آپریشن کے بعد ہالینڈ ہی میں انتقال ہو گیا)۔ مگر شاید اللہ کو خاندان کی بہبود کی اِس کاوش کی کامیابی منظور نہیں تھی۔ اچانک کچھ ممبران کے درمیان ایک ذاتی انا کا مسلہ حائل ہو گیا۔ نتیجتاً ساری محنت اور تگ و دو سرد خانے میں چلی گئی۔

۱۲ نومبر ۲۰۱۴ء کو اللہ نے ہمیں اپنی شادی کی پچاسویں سالگرہ منانے کا موقع بخشا۔ اِس عرصے میں اللہ نے ہمیں پانچ بچوں سے نوازا جن میں سے دو کو بچپنے ہی میں اپنے پاس بُلا لیا۔ بقیہ تین کا احوال کچھ یوں ہے کہ سب سے بڑی حسن آرا اِنتان (انڈونیشین ٹیم کا تجویز کردہ) نے ۱۹۸۹ء میں بین الاقوامی تعلقات میں ماسٹر (MSc International Relations) کیا اور میرے نیوی کے ساتھی (کمانڈر اقبال نصرت) کے چھوٹے بیٹے عدنان سے شادی ہوتے ہی مستقل طور پر کنیڈا آگئیں۔ اُن کے چار بیٹے ہیں جن میں دو (حمزہ اور ولید) گرجوئٹ ہو گئے ہیں اور دونوں چھوٹے (عمر اور رحیم) ابھی اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ درمیان والے فرید نے ۱۹۹۵ء میں کراچی سے MBA کیا اور دو سال نوکری کے بعد انہوں نے بھی کنیڈا کا رُخ کیا اور ۱۹۹۹ء میں اپنی پھوپی زاد ڈاکٹر فرح (دختر ڈاکٹر عیسیٰ اور ڈاکٹر صبیحہ) کے ساتھ شادی کی اور آج کل سعودی عرب میں فرانسیسی بنک کی ریاض برانچ میں کام کر رہے ہیں۔ اُن کے ایک بیٹا آیان (٦ سال) اور ایک بیٹی الیزہ (۳ سال) ہیں۔ سب سے چھوٹی نادیہ نے ہوم اکنامکس کالج کراچی سے پہلی پوزیشن میں ماسٹر کیا اور اپنے چچازاد (حاتم بھائی اور شہناز بھابی کے) احتشام سے شادی کے بعد کنیڈا چلی گئیں۔ اُن کے دو بیٹے، فرید (۱٦ سال)، نور (۸ سال) اور درمیان میں بیٹی آمنہ (۱۵ سال) جو آج کل تینوں اسکول میں ہیں۔

اسلم زیدی مصطفٰے زیدی خورشید زیدی

اعظم زیدی
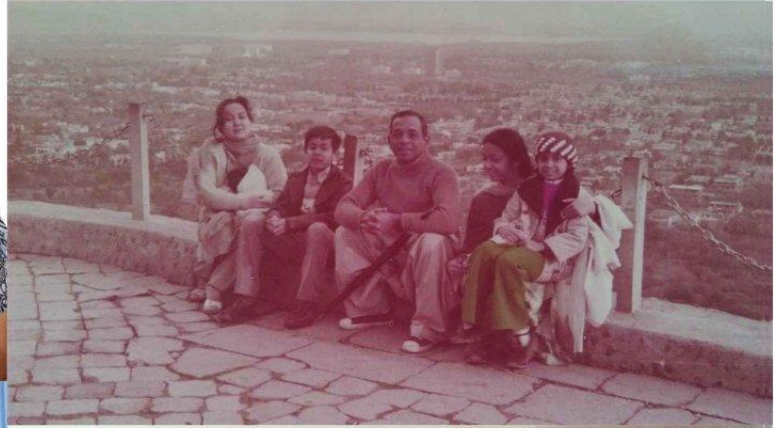
عاصم زیدی اکرم زیدی (قمر) ہما عالم (گڈو) سیدہ راضیہ اعجاز حیدر صبیحہ عالم (رانی) حاتم زیدی

کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

میثاق حسین

یہ عنوان میرے دوست احمد فراز کے شعر کا مصرعہ ہے۔

اگر مجھے صرف اپنا تعارف لکھنا مقصود ہوتا تو شاید کبھی نہ لکھ پاتا۔ لیکن میرے علاوہ یہ میری بہنوں اور بھائیوں کے خاندانوں کا معاملہ بھی ہے۔اس لئے میں نے یہ سطور لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اپنا تعارف خود لکھنا دودھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ اپنے بارے میں باتیں کرنا بور کام ہے۔ کوئی کافر ہی ان کے اس بیان سے اختلاف کرے گا۔ کیونکہ "مشک آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید"۔ انسانی خوبیاں خود ڈھول پیٹتی ہیں کہ آؤ! ہمیں دیکھو،، ہمیں سونگھو، ہمیں محسوس کرو۔۔۔! اس لئے تمام عمر اپنا تعارف بیان کرنے سے گریز کرتا رہا۔ سچ یہ ہے کہ بیان کرنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ ایک آواز تھی، سو گونجتی رہی۔ ایک قلم تھا جو لکھتا رہا سفید پوشی قائم رکھنے کے لئے۔

میری زندگی بزرگوں کی عطا کی ہوئی ہفت رنگ بہاروں کا تسلسل رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے دروازہ پر 'نو ایڈمیشن' کا بورڈ لگائے رکھا۔ اس لئے براڈکاسٹنگ جرنلسٹ ہونے کے باوجود بہت پرائیویٹ زندگی بسر کی ہے۔ میرا اثاثہ میرے بزرگ، میرے بیوی بچّے، میرے بہنوں بھائیوں کے خاندان اور ہم سب کی اولادیں ہیں۔ ماشاءاللہ۔ میں نے اپنے اور اپنے خاندان کے وقار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ نہ ستائیش کی تمنّا، نہ صلہ کی پرواہ۔

ہمارے نانا مولانا عبدالغفور اپنے وقت کے معروف اسکالر اور دھیمے لہجے کے خطیب تھے۔ اکثر سفر میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہم سب بھائیوں اور بہنوں کے تاریخی نام تجویز کیے۔ عزیزہ خاتون اور اشتیاق حسین زیدی کے گھر میں جب بھی کوئی ولادت ہوتی تو مولانا کو خط لکھا جاتا۔ مولانا کا تجویز کردہ نام ہمارے والد اشتیاق حسین زیدی ایک کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ دیگر تفصیل بھی ہوتی تھی۔ تاریخ، دن، وقت اور مقام ولادت۔ ان کی انگریزی اور اردو تحریر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

ساتوں بہنوں اور بھائیوں میں تاریخی ناموں کے علاوہ ایک اور قدر مشترک محنت تھی۔ ہماری امی خود بہت محنتی تھیں۔ دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں اور بچوں کو بھی مصروف رکھتیں۔ روز محنت کے فوائد بیان کرتیں۔ "کاہلی نحوست ہے۔ محنت کا خیال رکھو اور ہر کام محنت سے کرو"۔ ویسے تخلیقی صلاحیتیں بھی ہم سب میں موجود رہی ہیں۔

امی کی ان تقریروں سے نتیجہ یہ نکلا کہ ثریا غیور نے ہینڈ رائیٹنگ پر توجہ دینی شروع کی۔ کئی کئی گھنٹے سرکنڈوں کے قلم اور نِب والے قلم سے مشق کرتیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے حروف کے زاویے بنانے خود ہی سیکھ لیے۔ اس زمانہ کی لڑکیاں گول فریم میں کپڑا لگا کر رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کرتی تھیں۔ یہ کام ثریا غیور بھی کرتی تھیں۔ پھول، درخت، منظر اور اشعار وغیرہ رومال اور تکیوں کے غلاف پر کاڑھتی تھیں۔ مصداق بھی سیکھ گئے۔ دونوں بہن بھائی گرمیوں کی دوپہر میں کشیدہ کاری کرتے اور تربوز و خربوزہ کے بیج کھاتے تھے۔

پھر ثریا غیور کو کہانیاں، افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق ہوا۔ گھر کی لائبریری میں ہر موضوع پر کتاب موجود تھی۔ ہمارے چھوٹے ماموں جان سید سعید احمد زیدی کو فکشن کی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ثریا غیور نے یہ کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ گھر میں خواتین کے میگزین بذریعہ ڈاک آتے تھے۔ ثریا غیور نے ان پر بھی توجہ دی۔ پھر ایک روز مجھے لفافہ، تین صفحات اور خاتون مشرق (دہلی) دیا اور کہا لفافہ پر پتہ لکھوا اور اسے سپرد ڈاک کرو۔ کسی سے کہنا نہیں۔ میں بیوقوف نہیں تھا کہ ڈھنڈھورا پیٹتا۔ میں ان سے باورچی خانہ کے کام لیتا تھا۔ اس زمانہ کی لڑکیوں کو 'مردوں' کی اجازت کے بغیر مراسلت کی اجازت نہیں تھی۔ چند ہفتوں بعد ماہنامہ خاتون مشرق (دہلی) موصول ہوا تو اس میں ثریا غیور کا افسانہ موجود تھا۔ میں نے ہی اس کی تشہیر کی مولانا کے سوا سب کو دکھایا۔ حویلی میں بیوی نے کہا پڑھ کر سناؤ۔ بہت خوش ہوئیں۔ اس کے بعد ان کے لکھے ہوئے افسانے ہر ماہ خاتون مشرق میں شائع ہونے لگے۔ جب مہینہ کے پہلے ہفتہ میں خاتون مشرق کا اعزازی شمارہ موصول ہوتا تو اس کے ساتھ ایڈیٹر کا حوصلہ افزائی کا تعریفی مراسلہ بھی ہوتا۔ "محترمہ ثریا غیور صاحبہ۔۔۔!" یہ ثریا غیور ہماری بڑی بہن ہیں۔ یہی ان کا تاریخی نام ہے۔

پھر بٹوارہ ہو گیا۔ میں نے مینیجر صاحب کے ریڈیو پر پاکستان کا نام سنا۔ بہت گڑبڑ ہوئی۔ جب حالات بہت زیادہ خراب ہوئے تو بہت کم عمری میں رخصت ہو کر پاکستان آ گئیں۔ حالانکہ علاقہ میں اس وقت امن و امان تھا اور دان پور کے قلعہ میں داخل ہونے کی بھلا کون جراءت کرتا۔ اگر انہیں موقعہ ملتا تو اپنے وقت کی بہترین خاتون خطاط اور فکشن رائیٹر ہوتیں۔ کراچی پہنچتے ہی پڑھنے لکھنے کی بساط لپیٹی اور کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب کھول لی۔ اب ان کی باتوں میں افسانوی ادب کی چاشنی ہے اور کھانوں میں خطاطی کے زاویے۔ واہ۔ ثریا غیور (آپا جان) کے گڈّے

کا نکاح خوان بھی میں ہی تھا۔ان کے شوہر کا نام غیور حسین زیدی ہے۔اس لئے سنتے آئے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔ان دونوں کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ثریا غیور کے شوہر غیور حسین زیدی مرنجان مرنج قسم کے مجلسی انسان تھے۔ میرے ساتھ بہنوئی کا رشتہ قائم ہونے سے پہلے کا تعلق تھا۔ اگر مونالزا کی مسکراہٹ کو شہرت نہ ملتی تو ہر گھر میں غیور حسین زیدی کی تصویر ہوتی۔ مسٹر اسمائیل۔

میرا نام سیّد میثاق حسین زیدی ہے۔ ثریا غیور سے چھوٹا ہوں۔ ولادت کا سال مطلوب ہو تو سیّد سے پہلے "مہرانور" کا اضافہ کر دیجئے۔ مہرانور سیّد میثاق حسین زیدی-ولادت: اتوار صبح نو بجے، ۱۰ مئی ۱۹۳۶۔ مقام: ۲۴ نیا نگر، وائیسرائے روڈ، دہرہ دون کینٹ۔ برٹش انڈیا، سابق صوبہ اُتّر پردیش (یوپی)۔اب دہرہ دون نئے صوبے اُتّر کھنڈ کا کیپٹل ہے۔اس پتے پر ہمارا آبائی گھر ہوُا کرتا تھا۔

آغاز میں ہی اپنا تعارف کرا چکا ہوں۔اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھیے۔ میری اہلیہ کنیز فاطمہ کا آبائی تعلق اٹک، تلہ گنگ اور بعد میں بوجہ ولادت پشاور سے ہے۔ بخاری اور گیلانی سید ہیں۔ ددھیال گیلانی سنّی سید ہے۔ان کا پورا ڈھوک سیدوں کا ہے۔ ڈھوک فتح شاہ۔ سارے گھروں اور زمینوں پر صدیوں سے سیدوں کا راج ہے۔ زمینداری تقسیم ہوتے ہوتے سکڑ گئی ہے۔ ننھیال بخاری ہے۔ اکثریت کا مسلک اثناء العشری ہے۔ چند برس پہلے تک سب مل جل کر رہتے تھے۔ کسی کو کسی کے مسلک سے غرض نہیں تھی۔ سب کی جڑیں مشترک تھیں۔ زمینوں کی طرح۔ ان بخاریوں کی صدیوں پرانی گدّی ہے۔ اگر کنیز فاطمہ لڑکا ہوتیں تو "سجادہ نشین" ہوتیں اور ہاتھ میں تسبیح انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں پہن کر بخاریوں کی سیادت کر رہی ہوتیں۔ یہی ہو رہا ہے صدیوں سے۔

جب پہلی دفعہ گدّی پر گیا تو بخاریوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ باتیں کم ہوئیں، میرے ہاتھ زیادہ چومے گئے۔ واپس آکر خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھوئے۔ میں اور کنیز فاطمہ اس سجادہ نشینی کے توسط سے کوٹہ سسٹم میں آسانی سے سینیٹ یا قومی اسمبلی کے رکن بن سکتے تھے۔ شیوخ اور سجادہ نشین ہی تو سیاست دانوں کے جلسوں کو عوام اور الیکشن جیتنے کے لئے ووٹ فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ہم دونوں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی۔ ہم دونوں کا نظریہ ہے کہ سیاست (ہر جگہ) انسانوں کو جوڑنے کے بجائے انہیں تقسیم کرتی ہے۔

کنیز فاطمہ کا بچپن پیشاور میں گزرا۔ یونیورسٹی آف پیشاور سے اردو میں ماسٹر کیا۔ شعبہ اردو کی بزم ادب کی صدر رہیں۔ شادی سے پہلے فرنٹیر کالج برائے خواتین میں اردو لیکچرر تھیں۔ شادی کے بعد مستعفی ہو گئیں۔ جب اسلام آباد آئے تو دوبارہ ملازمت شروع کی۔ بیکن ہاؤس اسلام آباد، فیصل آباد اور ماچھی گوٹھ سے سفر کرتے ہوئے آرمی پبلک اسکول اینڈ انٹر میڈیٹ کالج (گرلز) پنو عاقل کی پرنسپل ہو گئیں۔ کنیز فاطمہ کا ادب سے تعلق رہا ہے۔ اردو کے قومی اخبارات میں ان کی نظمیں اور خواتین کے تعلیمی مسائل کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسلام آباد، لاہور اور فیصل آباد کے سیمینارز میں بھی شریک ہوتی رہی ہیں۔ شادی سے پہلے ریڈیو کے حالات حاضرہ کے ایک پروگرام میں کچھ عرصہ شرکت کی۔ شادی کے بعد نشری سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ البتہ پی ٹی وی کے لئے BBC کے کچھ دستاویزی پروگرام انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے۔ پروڈیو سروں کا خیال تھا کہ میں نے پابندی لگائی ہے۔ ہمارے دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

مصداق حسین مجھ سے چھوٹے بھائی ہیں۔۔ شروع میں آفتاب طلعت کا اضافہ کر دیں تو ان کا تاریخی نام بن جائے گا۔ بہنوں اور بھائیوں میں بہت پسندیدہ رہے ہیں۔ سماجی رشتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ نظریہ ضرورت کے تحت زندگی نے انہیں بھی خوب رگڑے دیے۔ بہر حال تاریخ میں ماسٹرز کیا اور جیسے تیسے انگلینڈ چلے گئے۔ مصداق نے اپنی زندگی کے سفر کا روڈ میپ تیار کیا ہوُا تھا۔

انگلینڈ میں پہلے اکنامکس پڑھی پھر چارٹرڈ اکاؤنٹینسی پڑھنے کے لئے داخلہ لیا۔ پڑھنا موقوف کرتے اور نوکری کر لیتے۔ پھر نوکری چھوڑتے اور پڑھنا شروع کر دیتے۔ لوہے کے چنے چبائے تو چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا اور زیدی اینڈ کو کے نام سے اپنی فرم بنالی۔ شب و روز محنت کی۔ محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ اللہ نے بہت برکت دی۔ زیدی اینڈ کو کی ایک برانچ دبئی میں بھی ہے۔ اس دفتر کے قریب ہی برج الخلیفہ کے ارمانی ریزیڈینس میں ان کا شاندار اپارٹمنٹ ہے۔ انگلینڈ میں سماجی کام کرتے رہتے ہیں۔ لندن کی مرکزی مسجد کے تیس سال سے سیکریٹری ہیں۔ سیاست میں حصہ لیا اور اپنے حلقہ کے کونسلر منتخب ہوئے۔ انگلینڈ کی حکومت کے کئی اداروں میں رکن رہے۔ سرکاری ٹریڈ ڈیلیگیشن میں دیگر ملکوں کے علاوہ پاکستان کا دورہ بھی کیا۔ اپنے بھائیوں، بہنوں اور ان کے خاندانوں کے سامنے ان کے نزدیک پیسہ، حیثیت، سماجی رتبہ ثانوی ہو جاتے ہیں۔ کئی دفعہ یوں ہوتا ہے کہ وہ میرے ساتھ کارپٹ پر لیٹ جاتے ہیں اور ہم باتیں کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔ وہ اپنی دولت پر فخر نہیں کرتے۔ اپنے رشتوں پر فخر کرتے ہیں۔ خاندان کے بچوں کی ترقی پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دی۔ پینسل سے اسکیچز بنایا کرتے تھے۔ میرا کلر پورٹریٹ بھی بنایا تھا۔ غم روزگار نے اس شوق کو فن نہ بننے دیا۔ اس کے سامنے اپنا خاندان اور مستقبل تھے۔ اسے اتنی فرصت کہاں میسّر تھی کہ مو قلم لے کر بیٹھتا۔

مصداق سے چھوٹی بہن کا نام ریحانہ ہے۔ حبیبہ جہاں ریحانہ خاتون۔ واقعیٔ وہ سب کی پیاری تھی۔ امی کی پیاری اس لئے تھی کہ وہ گھر اور حویلی کے درمیان میری تمام خبریں امی کو فراہم کرتی تھی۔ "بھائی صاحب نے سپاہی کو انعام میں بیڑی کا بنڈل دیا اور اس سے قینچی کی سگریٹ مانگ کر پی" کٹے ہوئے بالوں اور فراک میں گڑیا لگتی تھی۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ زمانہ نے اس کی قدر نہ کی۔ وہ ایک شفاف اور مخلص کردار کی شوہر پرست خاتون تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میری تینوں بہنیں شوہر پرست ہیں۔

ریحانہ کے شوہر کا نام سید اختر علی زیدی ہے۔ وہ پاکستان ایئر فورس سے ریٹائر ہو کر جدہ میں ملازمت کرتے رہے۔ ریحانہ اور اختر علی زیدی کے چار اولادیں ہوئیں۔ عمیر (حسنات)، کاشف، اشعر (حمید) اور اسفر۔ کاشف بچپن میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اشعر نے ڈبل انجنیئر نگ کی ہے۔ ایک قبرص سے دوسری امریکہ سے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے والدین نے اشعر کو قبرص کی مشہور یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا تھا۔ اسفر نے کراچی سے انجنیئر گ کی ڈگری لی ہے۔ وہ دبئی میں ملازمت کرتے ہیں۔ اشعر کینیڈا میں ہیں اور عمیر کراچی میں۔

ریحانہ بہت عرصہ تک گارمنٹس کا کاروبار کرتی رہیں۔ ایکسپورٹرز ٹھیکہ دیا کرتے تھے۔ ان کے کاریگر بھاگتے رہتے اور یہ نئے کاریگر تلاش کرتی رہتیں۔ اب ریحانہ ہیں نہ اختر علی زیدی۔ لیکن ان کے حیدری والے گھر کی محفلیں، دعوتیں اور ریاکاری سے پاک قہقہوں کی یاد مجھے ستاتی ہے۔ ان کے گھر میں فطری کلچر تھا۔

نجم جہاں میمونہ خاتون کے دو نام ہیں۔ میمونہ شادی سے پہلے۔ نجمہ شادی کے بعد۔ لیکن تاریخی نام نجم جہاں میمونہ خاتون ہے۔ ریحانہ اور نجمہ کے آپس میں تین رشتے تھے۔ بہنیں، دوست اور جٹھانی دیورانی۔ نجمہ کے شوہر اطہر علی زیدی، ریحانہ کے شوہر اختر علی زیدی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ نجمہ نے اردو میں ماسٹرز کیا ہے اور بچے پالنے کے ساتھ گارمنٹس بنانے اور خود ایکسپورٹ کرنے کا کاروبار کیا۔ نجمہ کے شوہر اطہر علی زیدی ڈپٹی آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے میرٹ کے مطابق آڈیٹر جنرل ہونے والے تھے لیکن۔۔۔!
نجمہ بھی بہت محبت کرنے والی بہن اور سوجھ بوجھ کی شخصیت ہے۔ نجمہ، ریڈیو پاکستان کے کوئٹہ اور آزاد کشمیر کے مظفر آباد اسٹیشنوں کے پروگراموں میں شریک ہوتی رہی ہیں۔ نجمہ اور اطہر کے تین بچے ہیں: ڈاکٹر عرشی حق، انجنیئر اسامہ (سعدی) اطہر اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ جویریہ۔ عرشی امریکہ میں اور اسامہ اور جویریہ کینیڈا میں ہیں۔

اعتاق حسین زیدی، راحت جاں ہیں۔ راحت جاں سید اعتاق حسین زیدی کا تعلیمی کیریر بہت شاندار تھا۔ یونیورسٹی آف پیشاور سے الیکٹریکل انجنیئر نگ کرنے کے بعد سعودی عرب وزارۃ الزراعۃ والمیاہ میں بطور سینیر انجنیئر تقرری ہوئی۔ ریاض میں مطار روڈ پر ان کی وزارت کے دفاتر تھے۔ یہ اور عتیق مکہ روڈ پر ایک بہت کشادہ اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ اس وقت تک دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کافی عرصہ بعد سعودی عرب کی ایک بہت معروف تعمیری فرم میں کنسلٹنٹ ہو گئے۔ اس حیثیت میں انہیں بے شمار مراعات دی گئیں۔ یہ اعزاز بھی ملا کہ اپنی کار بیت اللہ کے سامنے پارک کر سکتے تھے۔ اس طرح کی مراعات صرف شاہی خاندان اور ان کے قریبی حلقہ کو دی جاتی ہیں۔ لہٰذا جب بہت سے عزیز و اقارب عمرہ ادا کرنے جاتے تو اعتاق کے گھر قیام کرتے۔ اس طرح عمرہ کی ادائیگی اور مقدّس تاریخی مقامات کی زیارت میں سہولت رہتی تھی۔ ان کی اہلیہ شگفتہ انجم کے خاندان کا تعلق سیوہارہ اور نہٹور سے ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا اور کینیڈا منتقل ہونے کے بعد مزید تعلیم حاصل کی۔ اب دونوں میاں بیوی اسلام اور سماج کی خدمت کرتے ہیں۔ اعتاق نے کینیڈا میں "کارگو" کا کاروبار بھی کیا تھا۔ اب زیادہ وقت مسجد کو دیتے ہیں۔ اعتاق بھی پینسل سے خوبصورت اسکیچ بناتے تھے۔ میرے بھی دو پورٹریٹ بنائے تھے۔ ایک پینسل سے، دوسرا برش اور رنگوں سے۔

ہمارے سب سے چھوٹے بھائی عتیق حسین ہیں۔ اشراق عتیق حسین (زیدی)۔ اپنے بچپن میں 'ہمپٹی ڈمپٹی' تھے۔ کھیل کود میں گرنے اور چوٹیں لگنے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ یونیورسٹی آف پیشاور سے ماسٹرز کرتے ہی وفاقی وزارت ماحولیات میں افسر مقرر ہوئے اور اسلام آباد میں تعینات ہوئے۔ خاندان کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے ساتھ بچے بن جاتے تھے۔ بعد میں اپنے بچوں کے ساتھ بھی یہی کیا۔ دو ڈھائی سال بعد اعتاق کی کوششوں سے ریاض چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ وزارت خزانہ میں ملازمت کی اور ایک سعودی دوست کی شراکت میں بزنیس کی۔ دوست کے دل میں کچھ کھوٹ آگئی اور عتیق کا بڑا نقصان ہوا۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر صفیہ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج کی گریجویٹ ہیں۔ شادی کے بعد وہ ریاض کے کنگ خالد ہسپتال میں گائناکولوجسٹ ہو گئیں۔ عتیق کو اردو ادب اور جاسوسی ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ریڈیو پاکستان پیشاور کے بزم طلباء کے شعبہ نے ڈرامہ نویسی کے انعامی مقابلہ کا اہتمام کیا۔ شاید ۱۹۷۰ یا ۱۹۷۱ تھا۔ ان دنوں عتیق یونیورسٹی میں تھے۔ میری تعیناتی لاہور میں تھی۔ میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ ججوں کے پینل نے عتیق کے لکھے ہوئے ڈرامہ کو پہلے انعام کا حقدار قرار دیا ہے۔ آخر میں ایک سطر یہ بھی تھی کہ عتیق حسین، ڈرامہ نویس یثاق حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ خبر پڑھ کر میں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس پیشاور فون کر کے کہا کہ عتیق میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہیں انعام نہ دیا جائے۔ لیکن ایک شاندار تقریب میں انعام عتیق کو ہی دیا گیا۔ اس طرح کا معاملہ سویلم کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ ہفتہ طلبہ کے سلسلہ میں ہونے والے ایک مباحثہ میں سویلم پہلے انعام کے حق دار قرار دیے گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سویلم کو پہلا انعام نہ دیا جائے کیونکہ وہ ڈائریکٹر کا بیٹا ہے۔ اسلام آباد میں ہمارے صدر دفتر کی مداخلت سے سرینا ہوٹل فیصل آباد کی ایک شاندار تقریب میں پہلا انعام سویلم ہی کو دیا گیا۔

عتیق حسب مراتب گفتگو کرتے تھے اور بزرگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔

اب اپنے بچوں کا ذکر کریں گے۔ ہم سب نے اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ یہ بچے ہمارا مستقبل ہیں اور ان کی نیک نامی سے ہمارے بعد کا معاشرہ ہمارا نام محبت سے لے گا۔ ہم سب بہنوں اور بھائیوں نے اپنے اپنے بچوں کو بتایا ہے کہ کامیاب زندگی کا راز محنت، باہمی اتحاد و احترام، اعلیٰ تعلیم، اور معاندانہ و حاسدانہ رویّوں سے گریز میں ہی ہے۔ ان کے خاندان آپس میں میل ملاپ رکھیں گے تو زندگی کا سفر ہموار اور آسان رہے گا۔ بصورت دیگر۔۔۔ !کُڑھ کر زندگی بسر کرنا بہت بڑا عذاب ہے۔ معاذاللہ۔

ثریا غیور اور غیور حسین زیدی کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں: شاہد غیور۔ ان کی اہلیہ کا نام صبا اور بچے آمنہ احمد، رابعہ اور خضر ہیں۔ دوسرے بیٹے کا نام زاہد غیور ہے۔ ان کی اہلیہ کا نام سہیلہ اور بیٹی کا نام مریم ہے۔ پھر عابد غیور ہیں جو بھائیوں بہنوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ حنا ہیں جو اپنے شوہر کی طرح ایک آرکیٹیکٹ (انجنیئر) ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ معزّ اور زہرہ۔ عابد کینیڈا میں رہتے ہیں۔ زاہد رہتے تو کینیڈا میں ہی ہیں لیکن پاکستان آتے رہتے ہیں۔ کراچی میں کاروبار کرتے ہیں۔ سہیلہ ٹورونٹو میں کوئی ملازمت کرتی ہیں اور گھر سنبھالتی ہیں۔ صبا ملازمت نہیں کرتیں۔ صرف خاتون خانہ ہیں۔ ڈاکٹر رابعہ فارماڈاکٹر ہیں اور خضر شاہد انجنیئر ہیں۔ شاہد کراچی میں رہتے ہیں اور ملازمت کرتے ہیں۔ ثریا غیور ٹورونٹو اور کراچی کے درمیان سفر کرتی رہتی ہیں۔ آمنہ احمد بھی کینیڈا میں رہتی ہیں۔

بیٹیوں کے نام ڈاکٹر منزہ، صوفیہ اور فوزیہ ہیں۔ ڈاکٹر منزہ کے شوہر کا نام میجر (ر) شفقت سمیع ہے۔ پیشہ کے حساب سے انجنیئر ہیں۔ منزہ کے بیٹے کا نام حذیفہ ہے۔ حذیفہ بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ کینیڈا میں رہتے ہیں۔ صوفیہ کے شوہر کا نام اطہر غوری ہے۔ یہ خاندان حیدرآباد سندھ میں رہتا ہے۔ ان کے چار بچے ہیں۔ زبیر، عذیر، عمر اور مہین۔ غالباً عذیر ماڈلنگ میں اپنا مستقبل تلاش کر رہے ہیں۔ گڈ لک۔

فوزیہ کے شوہر ڈاکٹر حسنین آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ یہ خاندان بھی اب کینیڈا میں ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ فوزیہ نے حال ہی میں ٹورونٹو میں کسی 'سب وے' میں سرمایہ کاری کر کے اپنا بزنس شروع کیا ہے۔

میرے اور کنیز فاطمہ کے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ صائمہ، عاصم، سویلم اور عاتکہ۔

صائمہ ہماری بڑی بیٹی ہے۔ صائمہ نے گریجویشن کرتے ہی دو کام کیے تھے۔ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے انگلش ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لیا اور آرمی پبلک اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ کالج میں ٹیچر بن گئیں۔ انہیں بچپن سے ہی ٹیچر بننے کا شوق تھا چنانچہ آرمی پبلک اسکول کی بہت مقبول ٹیچر تھیں۔ بچے آرمی لائن پر فون کر کے مس صائمہ سے رہنمائی لیتے رہتے تھے۔ پنّو عاقل کی فوجی انتظامیہ نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب میں تعریفی سند بھی دی تھی۔ صائمہ کے شوہر اعجاز طیب صدیقی سیوہارہ کے معزز اور معروف خاندان کے فرزند ہیں۔ اعجاز طیب نے لاہور کی یونیورسٹی آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے پیٹرولیم میں گریجویشن کیا۔ اب دبئی میں تیل کے کنوؤں سے تیل نکالتے ہیں۔ صائمہ اور اعجاز کے تین بچے ہیں۔ زوبیہ طیب، ہادیہ طیب اور ایان طیب۔

عاصم زیدی نے پہلے پاکستان میں سائنس میں گریجویشن کی۔ پھر خیال آیا کہ امریکہ چلنا چاہیئے۔ امریکہ آ گئے۔ یونیورسٹی آف سدرن کولوریڈو سے پہلے ایک پھر دوسری انجنیئرنگ کی۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی بھی پڑھی۔ اب نوکری کے علاوہ بزنس بھی کرتے ہیں۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں ان کے دفاتر ہیں۔ ان دفاتر میں کام کرنے والوں کی تنخواہ کے ذیل میں لاکھوں روپئے کا زرمبادلہ ہر ماہ پاکستان بھیجتے ہیں۔ عاصم کی اہلیہ مریم امریکی کاکیشین ہیں۔ اردو بولنے کی مشق جاری ہے۔ عاصم اور مریم کے دو بچے ہیں۔ احمد ایک اسلامی اسکول میں پڑھتے ہیں اور عامر جو دن بھر اردو کی نرسری Rhymes سنتے ہیں۔ لکڑی کی کاٹھی۔۔۔ اردو اور انگریزی میں رواں ہیں۔ عاصم نے ثابت کیا کہ انسانی سہاروں کے بغیر ترقی ممکن ہے۔ مہینوں ڈبل روٹی سے پیٹ بھرا اور برفانی طوفانوں میں گیس اسٹیشن کے فرش پر راتیں بسر کیں۔

سویلم زیدی پاکستان آرمی میں میجر ہیں۔ کرمنالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ ان کی اہلیہ گل رخ کا تعلق خلجی خاندان سے ہے۔ خلجی ایران میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ شاہان خلجی (۱۲۹۰-۱۳۲۰ء) بڑے ہیبت والے بادشاہ تھے۔ کیا امراء اور کیا رعیت، سب خوف سے کانپتے تھے۔ یہ بادشاہ ٹیکس نافذ کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا ٹیکس نظام ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں بھی رائج تھا۔ گل رخ نے یونیورسٹی آف پیشاور سے فزکس میں ماسٹرز کیا۔ کچھ عرصہ کے لئے سونمیانی (بلوچستان) کے آرمی پبلک اسکول کی پرنسپل بھی رہیں۔ نوشہرہ چھاؤنی میں ان کے والدین کا گھر ہے۔ گل رخ کے والد کا نام محمد زمان خلجی ہے۔ نوشہرہ سے چند میل دور بدرشی میں ان کا ددھیال ہے۔ رسال پور کے قریب دریائے کابل پر ان کے نانا عبدالوہاب کا گھر ہے۔ گل رخ کی ننھیال رسال پور کے ہمسائے میں موضع 'گنڈیری' میں ہے۔ ہمارے بیٹے میجر سویلم زیدی کو بھی بہادری دکھانے پر کئی تمغے ملے ہیں۔ وزیرستان میں دہشت گردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دو دفعہ شدید زخمی ہوئے۔ دادا فخر کرتے ہوں گے۔ ہم دعا کرتے ہیں۔ سویلم اور گل رخ کے تین بچے ہیں: واثق سویلم، وثیق سویلم اور توثیق سویلم۔ گل رخ کے والد MES میں ایگزیکٹو انجنیئر تھے۔ جوانی میں وفات پائی۔

ہماری سب سے چھوٹی بیٹی عاتکہ ڈاؤن سنڈروم ہیں۔ ہمارے خاندان کی رونق ہیں۔ سیر و تفریح کی شوقین ہیں۔ بچپن سے ہوٹلوں میں کھانا پسند کرتی ہیں۔ اچھے لباس اور اچھے کھانے ان کی کمزوری ہے۔

مصداق حسین زیدی کے تین بچے ہیں۔ عبدالمنان زیدی، مہوش گوہیر، موثق زیدی۔ مصداق کی اہلیہ کا نام امینہ زیدی ہے۔ شادی سے پہلے امینہ خلجی تھیں۔ ان کے والد پاکستان آرمی میں بریگیڈیر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ میونسپل کارپوریشن کے چیئرمین رہے۔ امینہ نے یونیورسٹی آف پشاور سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا ہے۔

عبدالمنان نے بیس (۲۰) سال کی عمر میں انگلینڈ کی مشہور یونیورسٹی سے بی ایس سی، (آنرز) اکنامکس کرنے کے بعد تیئس (۲۳) سال کی عمر میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا۔ اب وہ زیدی اینڈ کو میں پارٹنر ہیں۔ کنول ان کی اہلیہ ہیں۔ مناہل اور میکائیل ان کے بچے ہیں۔ مہوش کے شوہر کا نام گوہیر ہے۔ انجنیئر ہیں۔ خود مہوش بیرسٹری پاس کر کے سولیسیٹر ہیں۔ مہوش اور گوہیر کے بھی دو بچے ہیں۔ اسحاق اور ایمان۔ موثق چارٹرڈ اکاؤنٹینسی پڑھ رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتے رہے ہیں۔ ان کی شادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہوگی۔

ریحانہ اور اختر علی زیدی کے بچوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ نجمہ اور اطہر علی زیدی کے تین بچے ہیں۔ ڈاکٹر عرشی حق۔ ہم تو انہیں عینی کہتے تھے۔ پھر جویریہ اور ان کے بعد اسامہ جنہیں سب سعدی کہتے ہیں۔ ان کی اہلیہ کا نام عائشہ ہے۔ عرشی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے شوہر عظام الحق انجنیئر ہیں۔ امریکہ میں رہتے ہیں۔ جویریہ نے پاکستان سے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا۔ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ میں نے بھی کہا کہ ڈاکٹر بن جاؤ۔ نہیں مانیں۔ خاندان میں پہلی خاتون چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں۔ ان کے شوہر ہیثم کی ہیں۔ عرشی اور عظام کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سارہ حق۔ سیف حق اور آمنہ حق۔

اسامہ اور عائشہ کے دو بچے ہیں۔ محمد اور مصطفٰی۔

جویریہ اور ہیثم کے دو بچے ہیں۔ سعد اور فہد۔

اعتاق کی اہلیہ شگفتہ انجم ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹرز کیا۔ کینیڈا آ کر مزید پڑھا۔ اعتاق اور شگفتہ کے پانچ بچے ہیں۔ ڈاکٹر حسن نبیل۔ فاطمہ، سارہ، لینا اور مریم۔

ڈاکٹر حسن نبیل کی اہلیہ کا نام ربیعہ ہے۔ نیویارک میں پیدا ہوئیں۔ لاء گریجویٹ ہیں۔ بیٹی کا نام حفصہ ہے اور بیٹے کا نام عثمان ہے۔

فاطمہ زیدی Behavior Therapist ہیں اور آٹوازم میں اسپیشلائز کر رہی ہیں۔ ان کے شوہر لئیق احمد سمیر انجنیئر ہیں اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا ہے۔ فاطمہ اور لئیق کے دو بچے ہیں۔ یوسف اور یحیٰی۔

سارہ زیدی ریگولیٹری افیئرز کی ایسوسی ایٹ ہیں۔ بائیو فارما انڈسٹری میں کام کرتی ہیں۔ فرحان پرویز ان کے شوہر ہیں۔ کارنیل یونیورسٹی سے انجنیئرنگ میں ماسٹرز کیا ہے۔ ایک بیٹی نورین پرویز ہے۔

لینا زیدی۔ Dietician اور Food Nutrition میں کوئی ڈگری ہے۔ شادی نہیں ہوئی۔ سب سے چھوٹی مریم ہیں۔ اس سال ہائی اسکول کریں گی۔

عتیق اور صفیہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ سدرہ، انعم اور فرحین۔ ریکارڈ کی بات یہ ہے کہ ماں اور تینوں بیٹیوں نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے گریجویشن کی۔ تینوں امریکہ میں رہتی ہیں۔ ڈاکٹر سدرہ کی شادی ڈاکٹر عمر عظیم سے ہوئی ہے۔ عائشہ عمر، بلال عمر اور آمنہ عمران کے بچے ہیں۔

ڈاکٹر انعم کے شوہر کا نام احمر زیدی ہے۔ یہ فیروز زیدی کے فرزند ہیں۔ بزنس انٹیلیجنس ڈیولپر ہیں۔ دایان زیدی اور رانیہ زیدی ان کے بچے ہیں۔ عتیق اور صفیہ کی چھوٹی بیٹی ڈاکٹر فرحین ہیں۔ ان کی شادی عظیم قریشی سے ہوئی ہے جو سینیر آڈیٹر ہیں۔

عتیق زیدی اپنے خاندان کے ساتھ بیس سال سعودی عرب میں رہے۔ان کے تینوں بچوں کی ولادت سعودی عرب میں ہوئی۔

ہمارے نانا مولانا عبدالغفور اور نانی بتول فاطمہ تھے۔ ریاست دان پور کے عظیم الشان قلعہ کے ایک حصہ میں رہتے تھے۔ نانا اسکالر تھے اور مبلغ بھی۔ نانی زمیندارنی تھیں۔ ہمارے دادا سید مشتاق حسین زیدی اور دادی سیدہ فاطمہ خاتون تھے۔ خاندانی بزنس تھا اور دہرہ دون میں رہتے تھے۔ ہمارے والدین عزیزہ خاتون اور سید اشتیاق حسین زیدی تھے۔

یہ سب میرا تعارف ہیں۔ان سب کے ساتھ ہی میری زندگی پر بہار ہے۔

یاد نہیں کس کا شعر ہے۔ موقع کی مناسبت سے اپنے بچوں کی نذر ہے۔

میں نہیں جانتا کاغذ پہ لکھا شجرۂ نسب
بات کرنے سے قبیلے کا پتہ چلتا ہے

دعوت فکر و عمل

مشعل راہ

—

اس حصے میں پاکستان ہجرت کرنے والے چند بزرگوں کا احوال درج ہے۔

دعوت فکر و عمل

حقیقی ترقی، خوشحالی اور کامیابی وہی ہوتی ہے جو پورے خاندان کی ہو۔ تنہا ترقی تو سب ہی کر لیتے ہیں لیکن ساری برادری کی فکر اور حسب استطاعت اعانت کی توفیق کم ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سادات بجنور کی کثیر تعداد پاکستان ہجرت کر گئی لیکن جڑ سے اکھڑے کے بعد کسی شجر کو از سر نو نشو نما شروع کرنی پڑتی ہے اور اسے خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں ان مہاجرین کی آمد کئی سال پر محیط ہے۔ ان میں سے کچھ خانوادے تخلیق پاکسان کے ابتدائی سال میں نقل مکانی کر کے نئے ماحول میں رچ بس گئے تھے لیکن انہیں آئندہ آنے والے عزیز و اقارب کی بھی فکر لاحق تھی۔ حاجی محمد خلیل اور ان کے صاحب زادے جمیل احمد زیدی (جو کہ ریلوے میں چیف اکاؤنٹینٹ تھے) نے لاہور میں سکونت اختیار کی تھی لیکن بعد میں وہ کراچی چلے گئے۔[46] جمیل احمد زیدی صاحب بعد میں اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان ریوینیو کے عہدہ پر فائیز ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ قرۃ العین حیدر اپنی سوانح کار جہاں دراز ہے میں رقم تراز ہیں:-

بھائی محمد جمیل اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے والد ماجد حاجی محمد خلیل، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید مولانا حسین احمد مدنی کے عقیدت مند اور اپنے عہد کے بیشتر عظیم ترین علماء و مشائخ سے وابستہ رہے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب قابل قدر ہستی تھے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی برٹش انڈیا میں ان کے بیٹے سید محمد جمیل آڈٹ آف اکاؤنٹس کے انٹرویو کے لئے جانے لگے۔ ان کے معاشی حالات اس وقت ایسے تھے کہ ملازمت کی ان کو اشد ضرورت تھی۔ لوگوں نے کہا میاں جمیل کی داڑھی انتخاب میں حارج ہو گی۔ حاجی محمد خلیل نے فرمایا "رزاق خدا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ میں ایک عہدے کے حصول کے لئے اجازت نہیں دے سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی جائے[47]۔

بھائی جمیل مع داڑھی نمایاں طریقے سے کامیاب ہو گئے۔ چچا محمد خلیل نے نہٹور اور لکھنئو میں کئی دینی مدرسے قائم کیے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اب وہ ڈھاکہ اور کراچی میں پیدل گھوم کر اسلامی مدارس کھولتے پھر رہے تھے اور گھوڑا گلی سے مری تک پیدل جاتے تھے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی تصنیف "پرانے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ محمد خلیل صاحب ہندوستان میں منشی خلیل کہلاتے تھے ان کی ابتدائی عمر کا زمانہ پنجاب اور صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) صوبے میں گزرا۔ یہیں کسی مقام پر انہوں نے انٹرنس پاس کیا اور ڈاک خانے میں ملازم ہو گئے۔ ابتدائے عمر میں انہوں نے اپنے فطری دینی ذوق اور طلب کی بنا پر حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب سے بیعت کی تھی۔ منشی جی نے قاضی صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ وہ ۱۹۳۴ء میں ریٹائر ہوئے اور حج کیا۔

میرے کرم فرما محترم خورشید عالم زیدی نے اپنے لاہور ہجرت کے سفر میں لکھا ہے کہ انہوں نے چند روز جمیل احمد زیدی صاحب کے گھر میں قیام کیا تھا۔ جمیل احمد زیدی صاحب بانی مدرسہ اشاعت قرآن، کراچی بھی تھے۔ میرے نانا ابن عباس صاحب مرحوم نے بھی پاکستان ہجرت کرنے کے بعد مدرسہ اشاعت قرآن میں کچھ عرصہ ملازمت کی تھی۔ حاجی محمد خلیل اور ان کے صاحب زادے جمیل احمد دین کی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ کراچی میں واقع جامع مسجد نیوٹاؤن کے قیام میں بھی جمیل احمد صاحب کا بھرپور کردار رہا ہے۔ محترم خورشید عالم زیدی یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاں اب جامعہ مسجد نیوٹاؤن واقع ہے شہر کے باہر سے آنے والے جانوروں کے آرام کرنے کا انتظام ہوتا تھا، یعنی کھلا میدان اور پانی چارے کا انتظام۔ یہ علاقہ ہندوؤں کا ہوتا تھا جو چلے گئے تھے۔ مہاجروں نے میدان کے کچھ حصّے میں مسجد کا احاطہ بنالیا تھا۔ اِن بزرگوں کا کرائے کا مکان میدان کے قریب ہی تھا۔ تبلیغ کا جذبہ دل میں موجزن تھا۔ پہلے اشاعت القران کے نام سے ایک ادارہ بنایا اور مسجد کے لئے پورا میدان الاٹ کرنے کی درخواست دے دی جو منظور ہو گئی۔ قُرب و جوار میں کھاتے پیتے گھرانے آباد ہو گئے تھے۔ مسجد کے لئے چندے کی کمی نہیں تھی۔ مسجد کی تعمیر فوراً شروع ہو گی اور نام جامعہ مسجد نیوٹاؤن رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد دیوبند مدرسے کے تربیت یافتہ ایک معلّم مولانا بنّوری گجرات کاٹھیاواڑ سے ہجرت کر کے کراچی آئے اور جمیل صاحب سے مسجد میں دینی تعلیم کے لئے ایک کمرے کی درخواست کی جس کی اُنہوں نے فوراً اجازت دے دی۔ اس ابتدا سے پیر پھیلاتے ہوئے (تقریباً) پوری مسجد پر قبضہ ہو گیا اور اس طرح اب یہ نیوٹاؤن کے بجائے بنّوریہ ٹاؤن مسجد کے نام سے زیادہ جانی جاتی ہے اور ایک مشہور مدرسے کی آماجگاہ ہے۔

اِن باپ بیٹے نے جامعہ مسجد نیوٹاؤن کے علاوہ خاندان کو اکٹھّا کرنے کے لئے ۱۹۵۶ء میں ایک اور ادارہ بھی انجمنِ سادات نہٹور (رجسٹرڈ) کے نام سے قائم کیا جو پابندی سے ہر ماہ خاندان کی خبروں کا ایک ماہ نامہ رسالہ بنام مرِقعِ سادات نہٹور پابندی سے شائع کئی برس تک کرتا رہا۔ حاجی محمد خلیل پہلے صدر انجمن سادات نہٹور تھے۔ اس تنظیم کا پہلا اجلاس ۱۱ مارچ ۱۹۵۶ء کے دن کراچی میں منعقد ہوُا اور مندرجہ ذیل گزارشات کثرت رائے سے منظور ہوئیں:-

- سادات نہٹور کی تنظیم و ترقی واصلاح۔
- سادات نہٹور کے نادار اور یتیم بچوں کی تعلیم کے لئے وظائف کا انتظام۔
- حسب استطاعت، انجمن نادار بیوگان سادات کے لئے گزارہ کا مناسب بندوبست۔
- مذکورہ بالا امور کی ترغیب و ترجمانی کے لئے مرقع سادات نہٹور کا اجراء۔ اس سے قبل مرقع نہٹور نامی رسالہ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا جس میں نہٹوری قلمکار اپنی نگارشات پیش کرتے رہتے تھے۔

---

46 مرقع سادات نہٹور اپریل ۱۹۵۶ء

47 حاجی محمد خلیل نہٹوری کے متعلق مفصل مضمون مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "پرانے چراغ" میں ملاحظہ فرمائیے۔

مرقع سادات نہٹور کے اپریل ۱۹۵۶ء کے شمارے کے مطابق اس زمانے میں ایک اور غیر فعال تنظیم بھی دہلی، ہندوستان میں موجود تھی جس کے انتظامی امور جناب نثار حیدر، جناب مشیر حیدر، جناب حاجی آل علی صاحب اور جناب خورشید حسن زیدی صاحب کے ذمے تھے۔ یہ تنظیم انجمن اصلاح وترقی وتعلیم نہٹور کہلاتی تھی۔ جناب خورشید حسن زیدی صاحب پاکستان ہجرت کر چکے تھے اور وہ بعد میں انجمن سادات نہٹور کراچی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی بنے۔

اِس کے علاوہ اِن باپ بیٹے نے کئی اور مدرسے اور مساجد بھی قائم کئے مثلاً حیدر آباد کالونی، جیل روڈ (عقب میں کشمیر روڈ) اور شہید ملت روڈ کے سنگم پر واقعہ مساجد، ملیر اور لانڈھی میں مدرسے۔ اِس کے علاوہ کئی جگہ مساجد اور مدرسوں کیلئے بڑے پلاٹ حاصل کئے جن میں سے بیشتر پر اب قبضہ ہو چکا ہے۔ اِسکے علاوہ یہ دونوں تبلیغی دوروں پر بھی جاتے۔ حاجی محمد خلیل صاحب اگست ۱۹۶۵ء میں کراچی میں فوت ہوئے۔ اُنہوں نے جنوبی کوریا میں اسلام متعرف کیا اور اُسکے دارالحکومت میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ حاجی جمیل صاحب ۲۶ جنوری ۱۹۸۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ دونوں باپ بیٹے (جمیل صاحب لاولد تھے) کے انتقال کے بعد کئی دوسرے بزرگوں نے جامع مسجد، اشاعت القران اور انجمنِ سادات نہٹور کے انتظامات کی دیکھ بھال کی جن میں حافظ عبدالرشی دندوی (ولد عبدالعزیز) نمایاں ہیں۔ الحاج حافظ عبدالرشید ندوی صاحب انجمن سادات نہٹور کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انجمن سادات نہٹور کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ان کی ایک اہم خدمت شجرہ سادات نہٹور کی طباعت واشاعت ہے۔ سادات بجنور کے پہلے نسب نامہ تذکرہ سادات نہٹور کے مصنف / مرتب تو عابد حسین مرحوم تھے لیکن صد افسوس کہ ان کی تحقیق سے چند خوش نصیب ہی استفادہ کر سکے۔ عابد حسین مرحوم کے حالات زندگی بھی دستیاب نہیں ہیں۔

الحاج حافظ سید عبدالرشید صاحب ندوی ایم اے۔ بی ٹی
ابن سید عبدالعزیز صاحب

حافظ عبدالرشید ندوی صاحب سید خلیل احمد صاحب (ایک آنہ فنڈ والے) کے برادر نسبتی تھے اور ان دونوں میں باہمی انسیت بھی تھی۔[48] انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کی خواہش اور دعاؤں کی برکت سے صغر سنی میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ حافظ صاحب نے اوّلاً نہٹور میں مولوی امتیاز حسین صاحبؒ سے عربی پڑھی اور مزید اسلامی تعلیم کی تکمیل کے لئے لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں گرامی قدر خلیل احمد (ایک آنہ فنڈ والے) کے مشورہ سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۲ء میں فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ندوہ میں تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے مشرقی زبانوں کے امتحانات منشی فاضل، مولوی عالم اور دبیر کامل آسانی سے پاس کر لیے۔ اس طرح پختگی ذہن کے بعد انگریزی کی طرف رجوع ہوئے اور یکے بعد دیگرے میٹرک، ایف اے، بی اے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ایم اے پاس کر لیا۔ اس طرح وہ مشرقی اور مغربی علوم کی قرار واقعی استعداد کے حصول کے بعد ۱۹۴۰ء میں یوپی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ قیام پاکستان کے بعد آپ ۱۹۵۰ء میں کراچی آ گئے اور یہاں صوبہ سندھ کے محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ کراچی اور اندرون سندھ کے کئی ہائی اسکولوں میں ۲۰ سال خدمات دے کر ۱۹۷۰ء میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہو گئے۔ حافظ صاحب کی علمی اور ادبی خدمات میں طویل عرصہ تک درس وتدریس کے بعد عربی زبان کی متعدد کتابوں کے اردو زبان میں تراجم ہیں جن کو کراچی کے معروف طباعتی اداروں نے وقتاً فوقتاً شائع کیا ہے۔ مثلاً:-

- مولانا عبدالقدوس انصاری کی کتاب "المدینۃ المنورۃ" جس کو مکتبہ علمیہ کراچی نے شائع کیا۔
- تاریخ بنو عباس وفاطمین مصر اور "معاشرتی علوم"۔ ان کو کفایت اکیڈیمی کراچی نے شائع کیا۔
- علامہ محمد شلتوت مصری کی کتاب "العقیدہ والشریعۃ" اور مشہور مصری مورخ عباس محمود العقاد کی سوانح ہائے حیات حضرات "ابو بکر صدیق"، "عثمان غنی"، "بلال بن رباح" اور تاریخ کی مشہور کتاب "البدایہ والنہایہ" کی جلد نہم ودہم کے تراجم ہیں جن کو نفیس اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

حافظ صاحب نے ۱۹۹۶ء میں امریکہ میں وفات پائی۔

48 بشکریہ "ہمارے اسلاف"، تصنیف شکیل احمد زیدی

میرا پیغام محبت ہے

مشاہدات و تاثرات

—

اس حصے میں مشاہیر سادات کی تلاش کے سلسلے میں اضافی جستجو کا خلاصہ ہے

میرا پیغام محبت ہے

کچھ لوگ فطری طور پر ہر شے کے روشن پہلو دیکھنے کو اپنا وطیرہ بنالیتے ہیں۔ وہ کبھی ناامید نہیں ہوتے اور معاشرے میں اپنا مقام بنالیتے ہیں۔ ایسے لوگ نامساعد حالات میں بھی علم کی جستجو میں سر گرداں رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض فطرتاً ملنسار ہوتے ہیں اور دوستانہ ماحول میں دوسروں کی مدد کرنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ ان سب کا اسلوب اور دائرہ کار یکساں نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی ذات سے باہر کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس دنیا میں اپنی آمد کے مقصد کو سمجھتے ہوئے معاشرے کی بہبودی کی بھی فکر رکھتے ہیں۔ بقول حافظ شیرازی، فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست۔ یعنی ہر کسی کی فکر اسکی ہمت کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ دادی نفیسہ اطاعت حسین بھی کچھ ایسی ہی خداداد صلاحیتوں کی حامل تھیں۔ انہوں نے اپنی خاندانی ذمہ داریاں بھی بخوبی نبھائیں اور قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرنے والے اعزاء واقرباء کی بازآبادکاری کی بھی فکر کی۔ خان بہادر اطاعت حسین میرے دادا صولت حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ دہلی میں وزارت خارجہ میں اعلی سرکاری عہدے پر فائیز تھے لیکن انہوں نے بٹوارہ کے اعلان کے بعد پاکستان میں ملازمت کو ترجیح دی اور پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کراچی میں اپنی رہائیش گاہ میں اپنے تمام بھائی بہنوں اور ان کی آل واولاد کو بسایا۔ دادے اطاعت حسین کی رہائیش گاہ ۲۰۸ فریئر اسٹریٹ پر واقع تھی جہاں ان کے اپنے خاندان کے علاوہ ان کے دو بڑے بھائی یعنی دادے صداقت حسین، میرے دادا صولت حسین، دادی زاہدہ بانو اور دادی شاہدہ بانو بھی ایک ساتھ اکھٹا رہتے تھے۔ خود میرے والد صاحب شجاعت حسین مرحوم بھی پاکستان ہجرت کے بعد یہیں قیام پذیر ہوئے اور کئی سال بعد دوبارہ لکھنؤ، ہندوستان جاکر میری والدہ تعظیم فاطمہ کو بیاہ کر اسی گھر لائے۔ میری پیدائیش تو گلبائی میٹرنٹی ہوم، صدر کراچی میں ہوئی لیکن میں نے بھی اپنی زندگی کا کچھ عرصہ ۲۰۸ فریئر اسٹریٹ میں ہی گزارا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے میرے والد صاحب کی لکھنؤ سے واپسی کے بعد عید کے موقعہ کی ایک یادگار تصویر۔ اس تصویر میں دادی نفیسہ اطاعت حسین کرسیوں پر بیٹھنے والوں کی صف میں بائیں طرف سے چھٹے نمبر ہیں۔ اسی صف میں میری والدہ تعظیم فاطمہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہیں۔ میرے والد صاحب اس سے پچھلی صف میں بائیں طرف سے آٹھویں نمبر پر کھڑے ہیں۔ فرش پر بیٹھے ہوئے بچوں میں بائیں طرف سے تیسرے نمبر پر دادی نفیسہ کی قابل فخر صاحب زادی امینہ سید نمایاں ہیں۔

اسے حسن اتفاق سمجھیں یا شومی قسمت کہ مجھے دو ماہ کی عمر میں ہی تھانے میں حاضری لگانی پڑی۔ یہ دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب میری والدہ تعظیم فاطمہ صاحبہ میری پیدائش کے تقریباً دو ماہ بعد لکھنؤ گئیں۔ اس زمانے میں پاکستانی پاسپورٹ رائج ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ والدہ صاحبہ کے پاسپورٹ کے اندراجات کے مطابق پاکستان سے روانگی کے وقت میری عمر ایک ماہ یا کچھ زائد تھی۔ مروّجہ قوانین کے مطابق، پاکستانی شہریوں کو بھارت کے تھانوں میں اپنی آمد کی اطلاع دینی پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ لکھنؤ میں واقع قیصر باغ پولیس اسٹیشن پہنچیں۔ اس طرح میں نے اپنی زندگی کے پہلے بیرون ملک سفر کا آغاز کیا۔ ملاحظہ فرمایئے میری والدہ صاحبہ کے پاسپورٹ کا مذکورہ صفحہ:

LEFT PAKISTAN
Via Ganda Singhwala
VISAS

لکھنؤ آمد کی طرح میری پاکستان واپسی بھی یادگار تھی۔ میرے والد شجاعت حسین صاحب خود لکھنؤ تشریف لائے تھے اور مجھے اور والدہ صاحبہ کو واپس پاکستان لے گئے تھے۔ وہ ریل کے ذریعے ممبئی تک پہنچے اور وہاں سے کراچی تک بحری جہاز سے سفر کیا۔ اس طرح میں نے کمسنی میں ہی بحری سفر کا تجربہ بھی کرلیا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد ہم لوگ ۲۰۸ فریئر اسٹریٹ پر دادی نفیسہ اور دادے اطاعت حسین کی رہائشگاہ واپس آ گئے۔

دادی نفیسہ اطاعت حسین سے میں بے شمار بار شرف ملاقات حاصل کر چکا ہوں اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ میرے والد صاحب کی اولاد سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔ وہ ہر کام بہترین طریقے سے کرنے کی قائل تھیں۔ وہ خاندان میں رشتے داروں کی ملازمتیں تلاش کرنے میں مدد دینے کے علاوہ مناسب رشتے کرانے میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ میری منگنی کی تقریب میں بھی انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ دادی نفیسہ خاندان کی تقریبات کے لئے نظمیں لکھنے کے لئے بھی وقت نکال لیتیں جن سے اجتماعات کی اہمیت بڑھ جاتی اور وہ یادگار ہو جاتے۔ انہوں نے رشتے داروں کو یکجا کرنے کے لئے خود خاص محفلوں کا اہتمام کیا۔ ان تقاریب کو بزم عزیزاں کہا جاتا تھا اور مجھے بھی کئی بار بزم عزیزاں میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔
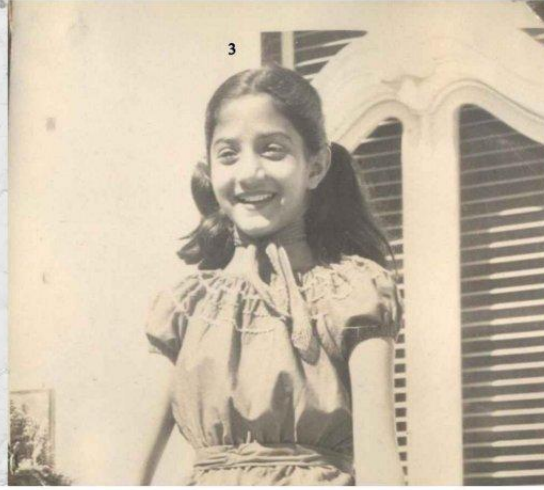
U. S. A. 195?

1. Nafees Fatima 2. Itaat Husain 3. Ameena Syed

دادی نفیسہ، میر احمد علی (سیوہارہ) کے صاحبزادے ڈاکٹر کرار حیدر کی نواسی تھیں۔ ان کے والد صاحب صغیر حسین برطانوی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائیز تھے۔ وہ صرف چار بر اس کی تھیں جب ان کی والدہ انیس فاطمہ کا ۱۹۱۸ء میں انتقال ہو گیا۔ دادی نفیسہ کا مجموعہ اشعار 'میر اپیغام محبت ہے' ۲۰۰۷ء میں چھپ چکا ہے جس میں سے ایک نظم ملاحظہ فرمایئے:

حقیقت میں عمل انسان کی پہچان ہوتا ہے
عمل انسانیت کا لازمی میزان ہوتا ہے

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"
یہی تو مصرعہ اقبل از قرآن بنتا ہے

تمیز حق و باطل سے بنا مخلوق میں اشرف
گو انساں میں چھپا شیطان اور حیوان ہوتا ہے

عطا کی امتیازی عقل و خیر و شر سے آگاہی
اب اس پر منحصر ہے جہل یا عرفان ہوتا ہے

چلے وہ راستی کی راہ یا کج اس کی مرضی ہے
کہ اعمالوں کا خود مختار ہر انسان ہوتا ہے

تعیّن زندگی کے سب قواعد اور ضوابط ہیں
گر ان سے منحرف ہو تو بہت خلجان ہوتا ہے

فرشتوں پر کیا انساں کو حق نے اس لئے افضل
ہو درماں درد دل کا اس کا یہ فرمان ہوتا ہے

کیا قابو میں اپنے نفس امارہ کو جس نے بھی
وہ راہ راست کا فاتح عظیم الشان ہوتا ہے

رضائے حق و خوشنودی عمل میں جس کے ہو شامل
وہ دنیاوی دباؤ سے نڈر ہر آن ہوتا ہے

جو انساں سے نہیں رکھتا توقع اور طلب کوئی
وہ بے غم، بے نیاز و بے غرض انسان ہوتا ہے

شریف و مخلص و عادل ہو ہمدرد و معاون ہو
ان ہی اوصاف کا "انسانیت" عنوان ہوتا ہے

نفیسہ کر عمل میں جذب ان اوصاف حسنہ کو
کہ عقبیٰ کے سدھرنے کا یہی سامان ہوتا ہے

[49] دادے اطاعت حسین وزارت خارجہ میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے مستقل سفر میں رہتے تھے۔ چند برس کراچی میں قیام کے بعد دادے اطاعت حسین کی تعیناتی نیویارک، امریکہ میں ہو گئی اور یہ گھرانہ نیویارک منتقل ہو گیا۔ یہاں سے وہ سان فرانسسکو چلے گئے جہاں وہ پاکستان کے قونصل جنرل مقرر ہوئے۔ فرائض منصبی کے تقاضوں کے مطابق وہ امریکیوں میں اپنے نو آزاد وطن پاکستان کے تعلقات کو فروغ دینے میں مصروف رہتے تھے لیکن دادی نفیسہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ بحیثیت سفارتکار، دادے اطاعت حسین سادات بجنور کے پہلے فرد تھے۔

۱۹۵۶ء میں یہ گھرانہ کراچی واپس آگیا جہاں دادے اطاعت حسین کی تقرری بحیثیت جوائنٹ سیکریٹری کے ہو گئی۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں حج کیا اور وہ ۱۹۸۸ء میں کراچی میں وفات پاگئے۔ دادی نفیسہ کا بھی کراچی میں ہی ۲۰۰۳ء میں انتقال ہوا۔ ان کے سات بچّے تھے جن کی انہوں نے مثالی تربیت کی۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر امینہ سید ہیں جو آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کی مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔[50] وہ ۱۹۸۸ء سے اس عہدے پر فائز ہیں اور انہیں ۲۰۰۵ء میں آرڈر آف برٹش ایمپائر کا اعزاز مل چکا ہے۔ یہ اعزاز انہیں اعلیٰ کارکردگی برائے حقوق نسواں، شعبہ تعلیم اور دانشورانہ املاک کے حقوق کے اعتراف میں ملا تھا۔ وہ پہلی پاکستانی خاتون ہیں جنہیں یہ اعزاز ملا۔ اس کے علاوہ ان کا شمار کراچی لٹریچر فیسٹیول کے بانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ۲۰۱۳ء میں فرانسیسی وزارت ثقافت کی طرف سے نائٹ آف دا آرڈر آف آرٹ اینڈ لیٹرز بھی مل چکا ہے۔

---

49 میر اپیغام محبت ہے، نفیسہ اطاعت حسین، مطبوعہ ۲۰۰۷ء

50 https://en.wikipedia.org/wiki/Ameena_Saiyid

حرف آخر

اب سے چند سال پہلے میں نے مشاہیر سادات نہٹور کی ایک فہرست بنانے کی اپنی بساط بھر کوشش کی تھی لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے چند ہی نام جمع کر سکا۔ یہ فہرست محترم خورشید عالم زیدی کی قائم کردہ ویب سائٹ میں بھی شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے چند مثالیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں:-

تاریخی شخصیات:-

سید حسن نہٹوری، جد سادات نہٹور

سید علی بن سید حسن نہٹوری:- بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ ایک بار سفر پر جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک گدڑی پوش ملا جو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس نے کپڑے مانگے۔ آپ نے جامہ دے دیا۔ اس کا سوال برقرار رہا حتیٰ کہ جو کچھ نقد پاس تھا وہ اور اسلحہ بھی دے دیا۔ وہ اس پر بھی قانع نہ ہوا اور آپ سے گھوڑا طلب کیا۔ آپ نے گھوڑا بھی عنایت کر دیا۔ اسی سخاوت کے پیش نظر آپ گھوڑا بخش مشہور ہوئے۔

میر احمد علی، سیوہارہ

عالم و دانشوران و محقق:-

- وقار علی بن مولوی تراب علی
- حافظ عبدالرشید ندوی
- مطلوب الحسن سید:- سوانح نگار، قائداعظم محمد علی جناح۔ یہ قائداعظم کے معتمد بھی تھے۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ہے **Muhammad Ali Jinnah, a political study**۔[51] یہ شوقیہ پایلٹ تھے لیکن بعد میں قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری بنے۔

سماجی و دینی خدمات:-

- خلیل احمد بن ابوالحسن، بانی ایک آنہ فنڈ
- محمد خلیل بن ڈاکٹر عرفان علی، بانی انجمن سادات نہٹور
- نفیس فاطمہ بنت ڈپٹی صغیر حسین

مصنّف:-

- سجاد حیدر یلدرم
- قرۃ العین حیدر

پہلے ڈاکٹر:-

- ڈاکٹر کرار حیدر بن احمد علی (سیوہارہ):- جولائی ۱۸۹۸ء میں ایک روز ڈاکٹر صاحب رائے بریلی میں کسی مریض کے پاس پہنچنے کی جلدی میں گھوڑا تیزی سے اڑائے لیے جاتے تھے۔ پل پر پہنچ کر اسپ بگڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سڑک پر گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ صرف ۳۵ سال عمر پائی۔
- ڈاکٹر نور افشاں بنت سید محمد عالم زیدی:- یہ پہلی خاتون ڈاکٹر ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں لاہور سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ پاکستان فضائیہ میں بھی شامل ہونے والی پہلی خاتون تھیں۔

کمسن ترین حافظ:-

- احمد علی ضیاء بن ضیاء طاہر زیدی:- انہوں نے نو سال کی عمر میں حفظ مکمل کیا۔

طویل العمری (سو سال یا زائد):-

- مہدی علی زیدی
- بنیاد حسین زیدی

اوّلین بیرون ملک شادی:-

- صلاح الدین حیدر بن نصیر الدین حیدر
- محمد ذاکر بن محمد ناصر

نقش امتیاز:-

- خان بہادر ضمیر الدین حیدر۔ یہ پہلے آئی سی ایس تھے اور علی گڑھ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔
- سعید الدین حیدر بن ڈاکٹر وحید الدین حیدر (۱۹۰۵ء - ۱۹۹۲ء):- یہ پہلے انجنیئر تھے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔
- جرار حیدر بن نثار حیدر:- یہ پہلے جج تھے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک الہ آباد میں تعینات رہے۔ ۱۹۹۲ء میں کانپور میں وفات پائی
- لقمان حیدر بن غنی حیدر:- یہ پہلے بینکر تھے۔ ۱۹۷۴ء میں وفات پائی۔

---

51 کارِ جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر

- خان بہادر اطاعت حسین بن مسرت حسین:۔یہ پہلے سفار تکار تھے۔
- ڈاکٹر سید تسلیم احمد زیدی۔ سیوہارہ مسلم لیگ کے صدر اور ایک سے زائید بار چیئر مین میونسپل کارپوریشن سیوہارہ، ضلع بجنور۔

اس فہرست کو حتمی نہیں سمجھنا چاہئیے۔ یہ صرف میری طرف سے ایک حقیر سی کوشش تھی۔

اک لفظِ محبت کا ادنٰی یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے
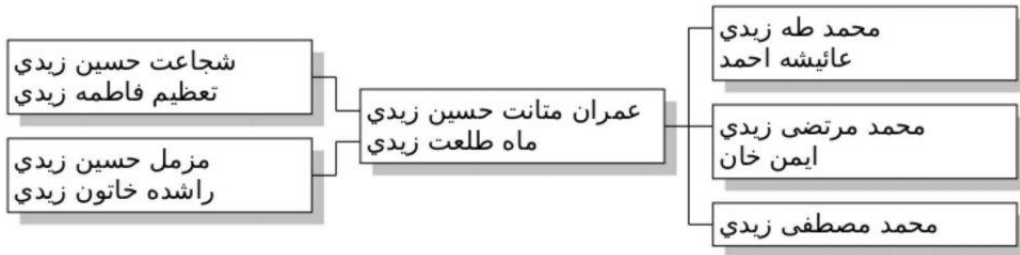
مجموعی جائزہ

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد اردو میں ہے جس میں تعارفی صفحات کے علاوہ سادات بجنور کی چنیدہ شخصیات کا احوال درج ہے۔ دوسری جلد انگریزی میں ہے جس میں نادر تصاویر کے ساتھ مکمل نسب نامہ درج ہے۔

اہداف

۱۔ سادات بجنور کو ان کے خاندانی پس منظر سے آگاہ کرنا۔

۲۔ باہمی قرابت داریوں کی نشاندہی کرنا۔

۳۔ یکجہتی پیدا کرنا۔

خصوصیات

سادات بجنور کا تعلق حسینی سلسلے سے ہے۔ چنانچہ اس نسب نامے کی مرکزی شخصیت حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ نسب نامے میں حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے آباء و اجداد، ان کی آل و اولاد، تاریخی حوالہ جات اور تمام افراد کی فہرست شامل ہے۔ کیونکہ سادات بجنور کی قرابت داریاں بین جملہ مسلمین میں ہوتی رہی ہیں، اس لئے سید یا غیر سید کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ اس پیشکش میں ۱۹۰۰۰ سے زیادہ افراد کے نام درج ہیں۔

ضروری وضاحت

بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے، کسی بھی فرد کی ذاتی معلومات ظاہر کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

سابقہ کاوشیں

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

ا۔ تذکرہ سادات نہٹور (غیر مطبوعہ) بزبان فارسی

مرحوم عابد حسین کا لکھا ہوا یہ گراں قدر نسخہ سات ضخیم جلدوں پر مشتمل تھا اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کبھی شائع نہیں ہو سکا۔

۲۔ شجرہ سادات نہٹور (مطبوعہ ۱۹۶۴)

حافظ عبدالرشید کی اس پیشکش میں تقریباً ۱۸۰۰ مرد حضرات کا تذکرہ ہے۔ یہ نسب نامہ سادات بجنور کے شجرہ نسب کی ترتیب میں کلیدی مقام رکھتا ہے اور ضروری تصحیح کے بعد اس پیشکش کا ایک اہم جز ہے۔

۳۔ شجرہ سادات عظام زیدی الواسطی (محلہ سادات نگینہ)

زیدی سلسلے کے اس نسب نامے کو مرحوم ابوعبداللہ محمد اسمٰعیل صاحب نے ترتیب دیا تھا لیکن اس نسخے کے صرف تیرہ صفحات دستیاب ہیں۔ متعلقہ قرابت داروں کی رہنمائی اور ضروری تصحیح کے بعد یہ نسب نامہ سادات بجنور کا جز بن چکا ہے

۴۔ شجرہ مبارک بزرگان سادات عظام زیدی الواسطی (محلہ سادات نگینہ)

عباس علی بن شریف علی زیدی صاحب نے ۱۸۹۶ء میں ترتیب دیا تھا اور اس کے اٹھارہ صفحات دستیاب ہیں۔ متعلقہ قرابت داروں کی رہنمائی کے بعد یہ نسب نامہ سادات بجنور کا جز بن چکا ہے۔

۵۔ رضوی سادات ترکولہ

مرحوم ہاشم رضوی کا تحریر کردہ یہ قلمی نسب نامہ اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ رضوی سادات ترکولہ کی تمام سادات نہٹور سے قرابت داری تھی۔ متعلقہ قرابت داروں کی رہنمائی کے بعد یہ نسب نامہ سادات بجنور کا جز بن چکا ہے۔

٦۔ امہ الانساب (مطبوعہ ۲۰۰۷)

محترم رضوان الدین انصاری کی اس تصنیف میں نہ صرف سادات ہند بلکہ انصاریاں، صدیقیاں، فاروقیاں، عثمانیاں، پٹھان، مغل، لودھی، چنگیزی، غوری، سلیمانی، اکشواکو ونش، یدوونش اور راجپوتوں کے مشجرات بھی درج ہیں۔ میں نے ان کی تحقیق کا اپنے اندراجات سے مقابلہ کیا تو حیرت انگیز حد تک درست پایا۔ ابھی اس تصنیف پر تحقیقات جاری ہیں۔ انصاری صاحب کا شجرہ نسب جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے۔

یا حجتہ القائمؑ ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤالدین رسولدار رحمۃ اللہ
زیدی الحسینی مدینۃ السادات اوچ شریف
نظرِ کرم
سخی السید مروت حُسین زیدی صاحب الحُسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی رحمۃ اللہ الحسینی رسولدار

یا حجتہ القائم علیہ السلام ادرکنی
روضہ مبارک سید السادات
السید علاؤالدین رسولدار رحمتہ اللہ
زیدی الحسینی مدینہ السادات اوچ شریف
نظرِ کرم
سخی السید مروت حُسین زیدی صاحب الحُسینی رسولدار
مکتبہ سادات زیدی رسولداران نہٹور
اس کتاب کی PDF کاپی برائے ایصالِ ثواب بزرگان
خاندان سادات زیدی رسولداران نہٹور تیار کی گئی ہے
منجانب
السید کاشان رضا زیدی الحسینی رسولدار
سجادہ نشین
آستانہ عالیہ حضرت قبلہ سید ریاست حُسین زیدی رحمتہ اللہ الحسینی رسولدار
محلہ علی پور پاکپتن شریف
وٹس ایپ نمبر 03007579114